Regd.L.NO 7243 Phone 880800

قرآنی نظامِ ربوبیّت کا پیامبر

طلوعِ اسلام

مئی 1985

اس پرچہ میں

۱۔ فکر اقبالؒ کا سرچشمہ۔ قرآن
۲۔ داغوں کی بہار (مسلسل)

شائع کردہ ادارۂ طلوعِ اسلام ۲۵۔بی۔ گلبرگ ۲۔ لاہور

قیمت فی پرچہ 4 روپے

قرآنی نظامِ ربوبیت کا پیامبر

طلوعِ اسلام

ماہنامہ ——— لاہور

بدل اشتراک	ٹیلیفون :- ۸۸۰۸۰۰	قیمت فی پرچہ
سالانہ پاکستان /۴۸ روپے غیر ممالک /۹۸ روپے	خط و کتابت ناظم ادارہ طلوعِ اسلام ۲۵-بی گلبرگ ۲ لاہور	۴ چار روپے
جلد ۳۸	مئی سنہ ۱۹۸۵ء	شمارہ ۵-

فہرست

۱- لمعات ——— ۲
۲- میرے بابا جی ——— (سلمیٰ پرویز صاحبہ) ——— ۸
۳- داغوں کی بہار ——— (مسلسل) ——— ۹
۴- حرام کی کمائی ——— (علامہ پرویزؒ) ——— ۱۷
۵- بابا جی کے بعد ——— (ثریا عندلیب صاحبہ) ——— ۳۱
۶- فکرِ اقبالؒ کا سرچشمہ۔ قرآن ——— (علامہ پرویزؒ) ——— ۳۴

ایڈیٹر محمد خلیل۔ ناشر شیخ عبدالحمید، مقام اشاعت : ۲۵ بی گلبرگ II لاہور۔ مطبوعہ : اشرف پرنٹنگ پریس ۹۔ ایبک روڈ لاہور

SARTAJ

لمعات

مئی کا مہینہ ہماری ملی تاریخ میں کئی وجوہ سے اہم ہے۔ مثلاً انگریزی سامراج کے خلاف بغاوت کر کے میرٹھ چھاؤنی کے مسلمان فوجیوں نے جنگِ آزادی کی شمع اسی مہینے روشن کی تھی۔ اور سرسید احمد خان (علیہ الرحمہ) نے قوم کے اذہان کو علم کی روشنی سے منور کرنے کے لئے ۲۴ مئی ۱۸۷۵ء کو مدرسۃ علی گڑھ کی بنیاد رکھی تھی۔

لیکن آج ہمارے پیشِ نظر موضوع، اپنی ملی تاریخ کا کوئی واقعہ نہیں بلکہ قریب سو سال پہلے شکاگو میں رُونما ہونے والے ایک واقعہ کی یادگار کے طور پر منایا جانے والا۔ مزدوروں کا عالمی دن۔ یوم مئی ہے۔

پس منظر اس کا یہ ہے کہ ۱۸۸۶ء میں شکاگو کے مزدوروں نے اپنے کچھ مطالبات پیش کئے۔ ان کے گرد و پیش کے حالات یقیناً آج کی نسبت زیادہ کٹھن تھے، لیکن ان کی تحریک کو کچل دیا گیا۔ لیڈر گرفتار ہوئے اور سزائے موت پا کر اپنے پیچھے اضطراب کی ایک مستقل لہر چھوڑ گئے۔

یہ مزدور تحریک آگے چل کر، کسطرح ٹریڈ یونین ازم اور پھر رفتہ رفتہ سوشلزم کی شکل اختیار کر گئی سر دست ہمارا موضوع یہ نہیں، بلکہ ہمارے پیشِ نظر وہ مسئلہ ہے جو اس وقت سے آج تک لاینحل چلا آ رہا ہے اور جسے حل کرنے کے لئے مقامی سطح پر آج بھی ہر سال باقاعدگی سے مطالبات پیش ہوتے رہتے ہیں جلسے جلوسوں سے گزر کر ہڑتالوں تک کی نوبت آتی ہے۔ مزدوروں کی اشک شوئی کی خاطر کچھ مطالبات کلّی یا جزوی طور پر مان لیئے جاتے ہیں۔ جلد ہی حالات بدل جاتے ہیں۔ مہنگائی بڑھ جاتی ہے اور مطالبات کا عفریت پھر پھنکارنے لگتا ہے اور یہ ابلیسی چکر اسی طرح چلتا رہتا ہے۔

دوسری طرف، اس مسئلہ کے حل نے دنیا کو دو بڑے متصادم بلاکوں میں تقسیم کر رکھا ہے۔ دونوں فریقوں کا دعویٰ حق پر ہونے کا ہے۔ دونوں انسانیت کی فلاح و بہبود کے علمبردار بنے ہوئے ہیں اور ایک دوسرے کو نیچا دکھانے کے لئے تباہ کن اسلحہ تیار کرنے کی لامتناہی دوڑ میں مصروف جبکہ انسانیت ان کے اس تصادم کے درمیان پس رہی ہے، کراہ رہی ہے۔ اس کے باوجود دعویٰ یہی ہے کہ انسانیت کی فلاح اور امن کے لیے وہ، یہ سب کچھ کر رہے ہیں۔ قرآن کے الفاظ ہیں:-

وَاِذَا قِيْلَ لَهُمْ لَا تُفْسِدُوْا فِى الْاَرْضِۙ۔ قَالُوْٓا اِنَّمَا نَحْنُ مُصْلِحُوْنَ ۝ اَلَآ اِنَّهُمْ هُمُ الْمُفْسِدُوْنَ وَلٰكِنْ لَّا يَشْعُرُوْنَ ۝ (2/11-12)

اور جب ان سے کہا جاتا کہ زمین میں فساد برپا مت کرو تو وہ کہتے ہیں (ہم کب فساد برپا کرتے ہیں) ہم تو اصلاح کرنے والے ہیں۔ خبردار رہو! یہی لوگ فسادی ہیں۔ لیکن انہیں اس کا شعور نہیں ہے۔

اس آیتِ کریمہ سے یہ بات بھی ظاہر ہے کہ ایسے لوگ اپنے فساد انگیز عمل میں لاشعوری طور پر مصروف ہوتے

ہیں، لیکن غلط اور درست کا کوئی خارجی معیار ان کے سامنے نہیں ہوتا اس لیے وہ سمجھ ہی نہیں سکتے کہ ان کا وہی عمل درحقیقت فساد کی جڑ ہے، جسے وہ بزعم خود اصلاح کی خاطر سرانجام دینے میں مصروف ہیں۔

ہاں تو! یوم مئی مزدوروں کا عالمی دن ہے۔ لفظِ مزدور دراصل مرکب ہے۔ مُزد۔ اور۔ دَور۔ سے۔ جس کے معنی ہیں اُجرت پانے والا۔ ایک آجر (اُجرت دینے والا) کا، اُجرت پر کام کرنے والے کو مزدور، کہنا تو سمجھ میں آتا ہے۔ حیرت تو اس پر ہے کہ خود مزدور بھی مُزدور رہنے پر قانع ہے۔ اور یہی صورت حال اس کے نام نہاد انقلابی لیڈروں کی ہے۔ مزدوروں اور ان کے لیڈروں کو اس بات کا احساس تک نہیں کہ ایسا سمجھنے سے وہ خود کو کس مقام پر لے آتے ہیں۔

نظامِ سرمایہ داری کا مدار اُجرت کے نظریہ پر ہے۔ اس نظام میں ایک فریق سرمایہ لگاتا ہے، ضروری سامان اور مشینری مہیا کرتا ہے اور دوسرا فریق اپنی محنت فروخت کرتا ہے اور سرمایہ کار کے مقصد کے حصول کے لئے محنت کرتا ہے۔ جبکہ سرمایہ کار اسے اس کی محنت کا معاوضہ ادا کرتا ہے۔ کام کرنیوالے کی محنت کا معاوضہ کتنا ہونا چاہیئے؟ اس کا تعیّن خود محنت کش نہیں بلکہ سرمایہ دار کرتا ہے۔ لیکن اس کیلئے کوئی پیمانہ، کوئی معیار مقرر نہیں۔ معاوضہ چونکہ کام کا ادا کیا جاتا ہے اس لئے ہونا تو یہ چاہیئے کہ معاوضہ کا تعیّن، کام کی مقدار اور نوعیت کے پیشِ نظر کیا جائے۔ لیکن اصلاً ایسا ہوتا نہیں ہے۔ کیونکہ کاموں کے تنوّع اور معیار کے فقدان سے ایسا ہونا ممکن نہیں ہے۔

مزدور کی اُجرت، معاشیات کے معروف اصول۔ طلب و رسد کے مطابق متعیّن کی جاتی ہے جسے اگر الفاظ کی جادوگری سے ہٹ کر حقیقت پسندانہ زاویہ سے دیکھا جائے تو وہ اس کے سوا کچھ نہیں کہ ایک مجبور کی مجبوری سے فائدہ اٹھا کر اس کا کس قدر، زیادہ سے زیادہ، استحصال کیا جا سکتا ہے۔ کسی شخص کی مجبوری جس قدر زیادہ ہوگی۔ اور ایسے اشخاص کی تعداد جس قدر زیادہ ہوگی۔ اُسی قدر استحصال زیادہ کیا جا سکے گا، یعنی انہیں اُجرت کم دی جائے گی۔ یہی وجہ ہے کہ جُوں جوں بیکاروں کی تعداد میں اضافہ ہوتا ہے اُجرت کم سے کم تر ہوتی چلی جاتی ہے۔ بالفاظ دیگر بیکار مزدوروں کی تعداد اگر زیادہ ہو تو وہ کام حاصل کرنیکی خاطر کم اجرت پر کام کرنے کے لیے تیار ہو جاتے ہیں۔ لیکن زیادہ اُجرت حاصل کرنے کی خواہش ان کے ذہن سے محو نہیں ہوتی۔ چونکہ کام کے مطابق اُجرت ملنے کا کوئی پیمانہ موجود نہیں لہٰذا اُجرت کے کم یا زیادہ ہونے کا حتمی فیصلہ کرنا ممکن نہیں۔ مزدور کی خواہش اور کوشش یہ ہوتی ہے کہ اسے زیادہ سے زیادہ اُجرت ملے اور آجر کی کوشش یہ کہ اسے کم از کم اُجرت دی جائے۔ اُجرت کے پیمانہ کے فقدان کا ایک نتیجہ یہ بھی ہے کہ مزدور کو کچھ بھی دے دیا جائے وہ اسے ناکافی محسوس کرتا ہے جبکہ آجر یہ سمجھتا ہے کہ اُس کو ضرورت سے زیادہ زیربار ہونا پڑ رہا ہے۔ یہ ہے آجر اور مزدور کے درمیان تصادم کی بنیادی وجہ۔

دنیا میں ہر چیز کے ناپ تول کے لئے پیمانے مقرر ہیں۔ جن کی رُو سے یہ فیصلہ کرنا آسان ہوتا ہے کہ کسی کے ساتھ ناانصافی ہو رہی ہے یا نہیں۔ لیکن جب کوئی پیمانہ یا معیار ہی موجود نہ ہو تو اُجرت

کے متعلق فیصلہ کیونکر کیا جا سکتا ہے کہ وہ انصاف پر مبنی ہے یا ظلم پر؟

یہ صورت احوال نظام سرمایہ داری کے ہاں تھی اور اب تک ہے۔ آجیر اور مزدور کے درمیان روز روز کے تصادم سے تنگ آکر اس مسئلہ کو حل کرنے کے لیے ایک اور نظام معیشت کی طرح ڈالی گئی جسے اشتراکیت یا سوشلزم کہا جاتا ہے۔ لیکن یہ مسئلہ پھر بھی حل نہیں ہوا۔ وجہ اس کی یہ ہے کہ وہ بھی مزدور۔ "مزدور" ہی ہے۔ وہاں بھی اسے اجرت ہی ملتی ہے کیونکہ سوشلزم کا فارمولا یوں بیان کیا جاتا ہے:-

"ہر شخص سے اس کی استعداد کے مطابق کام لیا جائے اور اس کے کام کے مطابق اسے معاوضہ دیا جائے"

سوشلسٹ نظام میں اگر فرق پڑا ہے تو صرف اتنا کہ نظام سرمایہ داری میں اجرت مقرر کرنے کا جو کام کوئی فرد (آجیر) یا افراد کی تنظیم (فرم) کرتی تھی سوشلسٹ نظام میں وہ کام حکومت کرتی ہے کیونکہ ذرائع پیداوار کو وہ اپنی تحویل میں لے چکی ہوتی ہے۔ اگر بغور دیکھا جائے تو صاف نظر آئے گا کہ یہ صرف آجیر کے نام کی تبدیلی ہے۔ جس سے مزدور کا مسئلہ حل نہیں ہو سکتا۔ بلکہ ایک لحاظ سے حالات بدتر ہو جاتے ہیں۔ نظام سرمایہ داری میں مزدور ایک آجیر سے کام چھوڑ کر دوسرے آجیر کے پاس بہتر شرائط ملازمت پر کام حاصل کر سکتا ہے جبکہ سوشلسٹ نظام میں مزدور جہاں چاہے کام کرے۔ اسے ایک ہی آجیر (حکومت) سے واسطہ پڑے گا۔ ذرائع رزق پر سوشلسٹ حکومت کی یہ اجارہ داری۔ مزدور کو کس طرح حیوانی سطح پر لے آتی ہے اور اسے کس قدر کم اجرت پر کام کرنے پر مجبور ہونا پڑتا ہے۔ اس کا تصور کیا جا سکتا ہے۔ اس بحث سے آپ یقیناً اس نتیجہ پر بھی پہنچ چکے ہوں گے کہ مزدور کا استحصال دونوں نظاموں میں ہوتا ہے۔ نظام سرمایہ داری میں بھی اور سوشلسٹ نظام میں بھی بلکہ سوشلسٹ نظام میں کچھ زیادہ ہی۔ لہٰذا یہ کہنے میں کوئی باک نہیں کہ مزدوروں کا مسئلہ حل کرنے میں یہ دونوں نظام ناکام رہے ہیں اور ان میں سے کوئی نظام بھی ایسا نہیں جو مزدوروں کا استحصال نہ کرتا ہو۔

اقتدار اگر اشتراکیت کے علمبرداروں کے ہاتھ میں آجائے تو بھی مزدور کی حالت بہتر نہیں ہوگی کیونکہ اجرت کے تعین کا مسئلہ پھر بھی جوں کا توں باقی رہے گا اور اجرت مقرر کرتے کے کسی خارجی معیار کے فقدان کے باعث یہ کشمکش جاری رہے گی۔ اس کا صرف ایک حل ہے اور وہ یہ کہ:-

اجرت پر کام کرنے کا تصور مٹا دیا جائے

اور ایسا صرف قرآن کی رو سے ہو سکتا ہے۔ قرآنی نظام میں سرمایہ کار اور محنت کش یا آجر اور مزدور کا امتیاز باقی نہیں رہتا لہٰذا اجرت کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

اس نظام میں اصول ربوبیت وہ ہے جسے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بالتصریح بیان کر دیا تھا کہ:-

"لوگو تمام دولت اللہ کی ہے اور میں اس کا قاسم ہوں تم تمام اللہ کے بندے ہو اور تمہارے اعمال کا نگران و محاسب بھی خدائے قدوس ہے اُسی کے احکام کو مدِنظر رکھو۔ اُسے سمیع و بصیر سمجھو اور کام کرتے رہو بقدر بھر محنت کرو اور میں تمہیں اتنا دوں گا جتنی تمہاری ضرورت ہوگی۔"

(بیہقی ۔ مسند کبیر ۔ الاوسط ۔ مستدرک ۔ الوسیط ۔ العرجون القدیم)

بالفاظ دیگر قرآن کا اصول ربوبیت یہ ہے کہ:-

" کام صلاحیت کے مطابق - دام ضرورت کے مطابق "
یاد رکھیئے یہ مقولہ لینن کا نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ کے آخری پیغمبر کا ارشاد ہے - اسی لیے تو لوئیس مارگن کو کہنا پڑا تھا کہ :-

" کام اہلیت کے مطابق دام ضرورت کے مطابق " - یہ اصول مارکس اور لینن کا ایجاد کردہ نہیں - اصل میں یہ بات پیغمبرِ صحرا نے کہی تھی - اُن کا یہ قول مجھے الوسیط میں لکھا ہوا ملا ہے کہ - " لوگو تمام دولت اللہ کی ہے اور میں اس کا تقسیم کرنے والا ہوں تم تمام اللہ کے بندے ہو اور تمہارے اعمال کا نگران و محاسب بھی وہی ہے - اُسی کے احکام کو مدِ نظر رکھو - اُسے سمیع و بصیر سمجھو اور کام کرتے رہو - نکمے اور نکھٹو نہ بنو - مقدور بھر محنت کرو اور میں تمہیں اتنا دوں گا جتنی تمہاری ضرورت ہو گی " مارکس اور لینن نے بھی یہی کہا تھا مگر ان سے خدا کا تصور چھین لینے کی جو غلطی سر زد ہوئی اُسی نے سوشلزم کو سرمایہ داری کا حصہ بنا دیا اور نتیجہ یہ ہوا کہ مارکس اور لینن کے دعوے چار دن میں ختم ہو گئے - مگر پیغمبرِ صحرا کا قائم کردہ نظام ریگزارِ عرب میں مدتوں مثالی معاشرہ کی تابانیوں میں جلوہ گر رہا -"*

قرآنی نظامِ حکومت میں ہر فرد معاشرہ کی ضروریاتِ زندگی کا مہیا کرنا نظامِ حکومت کے ذمہ ہوتا ہے (۱۵۱/۶ - ۲۱/۱۲) اور افراد معاشرہ تقسیم عمل کے اصول کے مطابق اپنی اپنی صلاحیتوں کے مطابق مختلف کام اپنا فرض سمجھ کر سرانجام دیتے ہیں - اس نظام میں آجر تو ایک طرف کسی ایسے شخص (سپروائزر) کا تصوّر بھی موجود نہیں جو خود کوئی کام نہ کرے بس دوسروں سے کام لینے کے لیے ان کی نگرانی کرے کیونکہ قرآنی نظام کے افراد جس اللہ پر ایمان لا کر اس نظام کے رکن بنتے ہیں اس اللہ تعالیٰ کی ایک صفت یہ بھی ہے کہ وہ ہر جگہ ہر شخص کے ساتھ موجود ہوتا ہے اور انہیں کام کرتے ہوئے دیکھ رہا ہوتا ہے (۵۸/۷ + ۵۷/۴) لہٰذا اللہ تعالیٰ پر ایمان رکھنے والے افراد - انسانی نگرانی کے بغیر اپنے ذمہ کے کام کو فرض سمجھ کر پوری محنت اور دیانت سے سر انجام دیتے ہیں -

ہم نے کہا تھا کہ مزدور اپنی محنت فروخت کر کے سرمایہ دار کے مقاصد کے حصول کے لئے کام کرتا ہے - اس طرح محنت کش انسان کس قدر حیوانی سطح پر آجاتا ہے اور یہ کیونکر تذلیلِ انسانیت ہے - اسے ایک مثال سے سمجھیئے - تانگہ بان اپنے تانگہ میں گھوڑے کو جوتتا ہے اور پھر اسے سارا دن یہاں سے وہاں - اِدھر سے اُدھر جگہ جگہ لئے پھرتا ہے - اس ساری بھاگ دوڑ میں گھوڑے کا اپنا مقصد کوئی نہیں ہوتا بلکہ وہ محض خوراک کے عوض دوسروں کا آلۂ کار بنتا ہے - کیا یہی کچھ مزدور کے ساتھ نہیں ہوتا ؟ کیا یہ اس کی بحیثیت ایک انسان کے تذلیل نہیں ؟

قرآنی نظام میں (منجملہ دیگر ارکانِ ایمان کے) ایک اللہ تعالیٰ پر ایمان لا کر تمام افرادِ معاشرہ باہم

---

* (HAVES AND HAVE NOTS BY LEWIS MORGAN P41)

بھائی بھائی قرار پاتے ہیں (۴۹/۱۰) یوں قرآنی معاشرہ ایک وسیع تر خاندان ہوتا ہے جس میں کوئی آجر و مزدور، کوئی حاکم و محکوم، کوئی ادنیٰ و اعلیٰ نہیں ہوتا۔ ؎

کس درین جا سائل و محروم نیست ۔ عبد و مولا، حاکم و محکوم نیست

ہر شخص اپنی ڈیوٹی سرانجام دیتا ہے براہ راست اللہ تعالیٰ کی نگرانی میں ہونے پر ایمان۔ عمل میں کوتاہی و خیانت نہیں ہونے دیتا۔ تکریم انسانیت ویسے بھی اس معاشرہ کی ایک اہم ترین قدر ہے۔ (۱۷/۷۰) لہٰذا اس معاشرہ کے کسی فرد سے کسی ایسی حرکت کے ارتکاب کا تصوّر بھی نہیں کیا جا سکتا جس سے کسی شخص کی توہین یا تذلیل کا پہلو نکلتا ہو۔

قرآنی تفاصیل کے مطابق ایک اللہ تعالیٰ پر ایمان کے ساتھ ساتھ قانونِ مکافاتِ عمل پر ایمان وہ محکم بنیاد ہے جس پر قرآنی نظام استوار ہوتا ہے۔ قرآنی معاشرہ کے افراد خوب جانتے ہیں کہ جو کچھ ہم خود استعمال کرتے ہیں۔ (خوراک۔ لباس وغیرہ) اس سے ہمارے جسم کی پرورش و حفاظت ہوتی ہے اور جو کچھ ہم دوسروں کی فلاح و بہبود کے لئے دیتے ہیں اس سے ہماری ذات کی پرورش ہوتی ہے۔ (۹۲/۱۸) جسم نے ایک دن موت سے ہمکنار ہو جانا ہے۔ جبکہ ذات نے باقی رہنا ہے لہٰذا وہ صرف بقدر ضرورت رکھ کر اپنی زائد از ضرورت آمدن کو دوسرے ضرورت مندوں کی نشوونما اور فلاح و بہبود کے لئے دے دیتے ہیں۔ (۲/۲۱۹) وہ یہ سب کچھ ہنگامی طور پر نہیں کرتے بلکہ اس معاہدہ کے مطابق کرتے ہیں جو انہوں نے اللہ تعالیٰ کے نمائندے۔ رسولؐ (یا خلیفۃ الرسول) کے ذریعے (۴۸/۱۰) ۔خود اللہ تعالیٰ سے کر رکھا ہوتا ہے۔ (۹/۱۱۱) یہی وجہ ہے کہ وہ یہ سب کچھ صلہ و ستائش سے بالاتر ہو کر کرتے ہیں۔ (۷۶/۸-۹) اور جب کبھی ایسا ہو کہ ان کے پاس ضرورت سے زائد ہو ہی نہیں بلکہ بمشکل اپنی ضرورت پوری کرنے کا سامان ہو اور ایسے میں کوئی اور ضرورت مند مل جائے تو قانوناً اس کی مدد کرنے کا پابند نہ ہونے کے باوجود وہ اس کی ضرورت کو اپنی ضرورت پر ترجیح دیتے اور اس کی مدد کرتے ہیں۔ (۵۹/۹) یہ وہ جذبۂ ایثار ہے جو صرف ایمان کی بدولت پیدا ہوتا ہے اور جس کے بغیر اتنا عظیم نظام چل ہی نہیں سکتا۔ اقبالؒ نے جب روس کو مخاطب کر کے کہا تھا ؎

اے کہ می خواہی نظامِ عالمے
جستہ اُو را اساسِ محکمے؟

تو اس کا اشارہ قرآن حکیم کے پیش کردہ انہی ارکانِ ایمان کی طرف تھا۔ یہ ہے وہ نظام جس میں اُجرت کا تصوّر مٹ جاتا ہے۔ اور محنت کش، حیوانوں کی طرح کسی سرمایہ دار کا آلۂ کار بننے کی بجائے ایک با اختیار، باعزت انسان کی حیثیت سے تقسیمِ عمل کے مطابق اپنے حصّہ کا کام بطورِ فرض سرانجام دیتا ہے۔ اُسے اپنی اور اپنی اولاد کی ضروریاتِ زندگی کی فکر لاحق نہیں ہوتی کہ یہ ذمہ داری اس نظام نے اپنے سر لے رکھی ہوتی ہے۔ (۲۰/۱۱۸-۱۱۹ - ۶/۱۵۱ - ۱۷/۳۱) جو اس وسیع تر خاندان نے قائم کر رکھا ہوتا ہے۔ جس کا یہ خود ایک فرد ہوتا ہے۔

اس نظام میں معاشی اطمینان کے علاوہ انسان اس حقیقی آزادی سے بہرہ ور ہوتا ہے جس کا کہیں اور

وجود تو ایک طرف، تصور تک نہیں پایا جاتا۔ یہ نظام قانون کی حکمرانی کا علمبردار ہوتا ہے۔ قانون کسی انسان کا نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ کا نافذ ہوتا ہے کہ:۔

سروری زیبا فقط اس ذاتِ بے ہمتا کو ہے
حکمراں ہے اک وہی باقی بتانِ آذری ! (۱۲/۴۰)

اس نظام میں کوئی شخص قانون سے بالاتر نہیں ہوتا (۶/۱۵ - ۵/۸) ہر شخص سے انصاف کیا جاتا ہے حتیٰ کہ دشمن سے بھی (۵/۸)۔ بھلا ایسے نظام میں کسی محنت کش فردِ معاشرہ کے ساتھ کسی ظلم وزیادتی کا تصور تک بھی کیا جا سکتا ہے؟

سرمایہ و محنت کی چپقلش کا حل نہ امریکہ اور یورپ کے سرمایہ دارانہ نظام کے پاس ہے نہ روس اور چین کے سوشلسٹ نظام کے پاس۔ کیونکہ دونوں نظاموں میں کام کی اُجرت کا تصور موجود ہے اور یہی تصور سارے فساد کی جڑ ہے۔ محنت کشوں کے مسئلہ کا واحد، حقیقی اور اطمینان بخش حل صرف قرآنی نظامِ حکومت میں مضمر ہے جو کفالت و ربوبیتِ عمومی کا ذمہ دار ہے۔ یہ انقلاب ہو تو بڑا انقلاب ہو۔

قارئین کیلئے مژدہ

مفکرِ قرآن علامہ پرویزؒ کی تفسیر قرآن مطالب الفرقان کی جلد ششم طباعت کے لئے پریس کو بھیج دی گئی ہے قیمت اور دیگر کوائف کے لئے اعلان کا انتظار فرمائیں

ناظم

میرے باباجی

پیارے باباجی! آپ اپنی سلمیٰ بیٹی کو غمزدہ چھوڑ کر چلے گئے۔ اب امید ہے تو آپ کے فرمان کے پیشِ نظر کہ "بیٹا یہ تو قانونِ قدرت ہے۔ صحیح راستوں پر چلتی رہو گی تو ایک دن ضرور مجھ سے آن ملو گی۔ ہم وہاں ایک دوسرے کو پہچانیں گے۔ تم مایوس نہ ہو۔" ہاں باباجی میں غمزدہ تو ہوں مایوس نہیں ہوں۔

باباجیؒ کا روزانہ شام کو میرے گھر آنا میرے لئے کچھ کم خوش نصیبی نہ تھی۔ سوچتی ہوں کہ میں بھی کتنی خوش نصیب تھی کہ نہ صرف باباجی کے زیرِ سایہ پرورش پائی بلکہ (بعد میں) علم کا یہ خزانہ خود چل کر میرے غریب خانہ پر تشریف لاتا — اور میرا ہر مسئلہ بغیر محنت کئے حل ہو جاتا۔

باباجیؒ کو بچوں سے بہت محبت تھی۔ اکثر کہا کرتے کہ "بیٹی میں تو ایک آدھ گھنٹہ صرف بچوں کو دیکھنے آتا ہوں۔ بچوں کی پاکیزہ اور معصوم محبت میں کوئی بناوٹ نہیں ہوتی۔ ان کو کھیلتا دیکھ کر مجھے زندگی کی حرارت ملتی ہے۔ مجھے کہتے "بیٹا — ایسی اچھی اور ذہین اولاد اللہ تعالیٰ کی دین ہے اس کے لئے اس کا شکر ادا کیا کرو — لیکن تمہارے ذمے یہ کام ہے کہ ان کو صحیح راہ پر ڈالو اگر تم نے ایسا کیا تو دیکھنا یہ ایک دن بہت نام پیدا کریں گے۔"

باباجیؒ کو اپنے کام سے جس قدر محبت تھی اسے ان کے احباب خوب جانتے ہیں۔ آخری دنوں میں جب اپریشن کے لئے جانا تھا تو ڈاکٹر زاہدہ نے تسلی دیتے ہوئے کہا — "باباجان! آپ کوئی فکر نہ کریں اس اپریشن میں گھبرانے کی کوئی بات نہیں ہے" — تو آپ نے نظریں اٹھائیں، بے حد حسرت سے ایک آہ بھری اور کہا — "بیٹی ابھی میرا بہت کام باقی ہے"۔

پیارے باباجیؒ آپ نے شفقت کی چار دیواری میں رکھ کر مجھے وہ کچھ سکھایا کہ جب میں نے دنیا کو دیکھا تو بالکل نہ گھبرائی — باباجی میں ہمیشہ آپ کے بنائے ہوئے اصولوں پر چلوں گی۔ چاہے زمانے کی کتنی بھی تیز و تند ہوائیں مجھے ڈرائیں میں آپ کے بنائے ہوئے اصول نہ چھوڑوں گی کیونکہ یہی ایک طریقہ ہے جس سے میں آپ تک دوبارہ پہنچ سکوں گی۔

باباجی کے بچھڑنے کے بعد ان کی اکثر طاہرہ بیٹیوں نے تڑپ تڑپ کر بتایا کہ جب ان کے والد کا سایہ ان کے سر سے اٹھا تو باباجی کے سایہ کی ٹھنڈک نے وہ غم زیادہ محسوس نہ ہونے دیا۔ ان کا کہنا ہے کہ وہ دراصل اب یتیم ہوئی ہیں — اب ہمیں ایسا شفیق بابا کہاں ملے گا۔

میرے باباجیؒ کے نام

کہاں ہو میرے دل کو خوشی دینے والو　دل اس اِک خوشی کو ترس گیا ہے۔!
کتنا خوش نصیب تھا وہ اک آنسو　جو کبھی میری آنکھ میں نہ دیکھ سکتے تھے
ہزار دل آنسو ہیں آج میری آنکھوں میں　آنکھ اس اِک آنسو کو ترس گئی ہے
تیرے دکھائے ہوئے راستوں پہ　آج بھی تیرے قدموں کے نشان
مجھے دعوتِ عمل دیتے ہیں کیونکہ　مایوسی تیرا دیا ہوا سبق نہیں ہے

(سلمیٰ پرویز)

داغوں کی بہار (مسلسل)

ع۔ ابرِ رحمت دامن از گلزارِ ما برچید و رفت

ادارہ مفکرِ قرآن محترم علامہ پرویز صاحب کے سایہ شفقت سے محروم ہوا تو مرحوم کے عزیزوں رفیقوں، آشناؤں، ہمدردوں اور شاگردوں نے ہمیں بے انداز تعزیت نامے لکھے۔ جیساکہ گذشتہ اشاعت میں لکھا جا چکا ہے ہم ان سب اصحاب سے فرداً فرداً اظہار تشکر سے معذور ہیں۔ ان خطوط میں سے چند ایک اقتباسات درج ذیل کئے جاتے ہیں۔ (ادارہ)

★ علامہ غلام احمد پرویز صاحب کی وفات کی خبر سن کر مجھے جو صدمہ ہوا ہے اسے الفاظ میں بیان نہیں کرسکتا ہوں۔ وہ ایک منفرد عالمِ دین، عظیم مفکر اور دانشور تھے۔ تحریکِ پاکستان کے دوران انہوں نے دو قومی نظریے کی حمایت میں اتنا کام کیا جسے فراموش نہیں کیا جاسکتا۔ انہوں نے قرآنِ کریم کی تعلیم سے لاکھوں مسلمانوں کے دل و دماغ کو روشنی بخشی اور اپنی زندگی قرآن حکیم کی تعلیم دینے کے لئے وقف کر دی تھی۔ قرآن کریم پر مبنی ان کی بے شمار تصانیف ہزاروں صفحات پر پھیلا ہوا "طلوعِ اسلام" اور ہفتہ وار درسِ قرآن حکیم اس پر شاہد ہے کہ دنیائے اسلام، ایک عالم دین، عظیم مفکر اور دانائے راز سے محروم ہوگئی ہے ۔۔۔۔۔۔

ع دگر دانائے راز آید کہ ناید

اللہ تعالیٰ انہیں اپنے جوارِ رحمت میں جگہ دے اور ان کے مشن کو دوام بخشے۔ آمین۔

(شریکِ غم محمد اسماعیل راجہ جنگ۔ ضلع قصور)

★ ہمارے محبوب ساتھی، بانیٔ ادارہ طلوعِ اسلام اور "قائداعظم" کے دیرینہ ساتھی ہم سے بچھڑ گئے۔ ان کی وفات سے عالم اسلام کا کافی نقصان ہوا ہے۔ قانونِ خداوندی سے تو کوئی انحراف ممکن نہیں لیکن ان کی وفات سے جو خلا پیدا ہوا ہے وہ بمشکل ہی پُر ہوگا۔

(عبدالکریم و محمد یٰسین۔ قصور)

★ **مجاہدِ اسلام**، مفکرِ قرآن باباجی غلام احمد پرویز کی ناگہانی موت سے ہمارے قلبوں پر اس قدر گہری چوٹ پڑی ہے کہ تمام بزم تاحال نوحہ کناں ہے۔ ہم حالیہ صدی کے اس عظیم قرآنی مفکر کی بے لوث دینی خدمات کو سلام کرتے ہیں اور عہد کرتے ہیں کہ زندگی کے آخری

سانس تک بابا جی کی طرح قرآنی فکر کو آگے بڑھاتے رہیں گے۔

بزم طلوع اسلام بہاول پور

ہارون الرشید خاں۔ عبدالوحید خاں۔ ملک شیر خان

عبدالخالق۔ صادق علی ناشاد۔ ڈاکٹر بشیر احمد۔

★ حضرت بابا جی کی رحلت کو امتِ محمدیہ کی عظیم بدنصیبی سے تعبیر کیا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔ ان جیسے عظیم ریفارمر کبھی کبھار ہی پیدا ہوتے ہیں۔ پچھلی ایک صدی میں چار اشخاص نے عوام پر عموماً اور اہل فکر ونظر پر خصوصاً بڑا گہرا اثر چھوڑا ہے۔ وہ شخصیات سرسید احمد خاں۔ حضرت قائداعظم محمد علی جناحؒ۔ حضرت علامہ اقبالؒ اور محترم غلام احمد پرویز تھیں۔

(خلیل الرحمٰن چک نمبر ۳۰۲ HR ضلع بہاول نگر۔

★ پرویز صاحب مرحوم کی وفات ایک قومی سانحہ سے کم نہیں۔ میں زمانۂ طالب علمی (۱۹۴۲ء) سے ان کی تحریمات پڑھتا رہا ہوں۔ مجھے پاکستان کا حامی بنانے میں ان کی تحریروں کو بھی بڑا دخل ہے۔ اللہ تبارک وتعالیٰ ان کو جنت الفردوس میں جگہ دے۔

(میر عبدالعزیز۔ راولپنڈی)

★ علامہ صاحب کے رخصت ہو جانے سے جو خلا پیدا ہو گیا ہے وہ کبھی بھی پر نہیں ہو سکے گا۔

(حافظ عبدالمجید۔ پنڈ دادنخان)

★ بابا جی کا فکر تا قیامت زندہ رہے گا۔ حق دبایا نہیں جا سکتا۔ بابا جی کا فکر حق ہے۔ خدا تعالیٰ بابا جی کو جنت میں جگہ عطا فرمائے۔ آمین۔

(محمد اکبر خاں جہلم شہر)

★ مفکرِ قرآن غلام احمد پرویز صاحب قضائے الٰہی سے اس دنیا سے رحلت فرما گئے ہیں۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیۡہِ رَاجِعُوۡن۔

انہوں نے دین کی بہت خدمت کی ہے۔ افسوس ہے کہ ان کو سمجھنے والے بہت کم تھے۔ ہماری ناقص عقل کہتی ہے کہ وہ واقعی مفکرِ قرآن تھے۔

(محمد عمر چنیوٹ)

★ ۲۴ فروری کی شام علامہ پرویز کی رحلت کی اندوہناک وجانکاہ خبر ریڈیو اور ٹیلی ویژن پر سنی۔ اللہ انہیں اپنے جوارِ رحمت میں جگہ دے۔ اور ان کے درجاتِ عالیہ بلند کرے۔ جن کے وہ صحیح معنوں میں مستحق ہیں۔ آمین ثم آمین۔ جانا ہر ذی روح نے ہے مگر بعض ہستیوں کے چلے جانے سے جو خلا پیدا ہوتا ہے، وہ مدتوں پر نہیں ہوتا۔ صاحبِ موصوف بھی ایک ایسی ہی عہد آفریں شخصیت تھے۔ ایسا نظر آتا ہے کہ دنیائے اسلام میں اس وقت ایسی اور کوئی ہستی نہیں جو ان کی جگہ لے سکے۔

(احمد سبحانی ملتان)

★ پرویز صاحب کے انتقال کی خبر نے ہمارے دلوں پر بجلی گرا دی۔ یوں محسوس ہوتا تھا جیسے سروں سے چھت ہی اٹھ گئی ہو۔ یہ ایک ایسی تلخ حقیقت تھی جس کے سننے کے لئے ہمارے کان بالکل تیار نہیں تھے ہم ایک ایسے عظیم مفکرِ قرآن سے محروم ہو گئے ہیں جو کہ سرسید۔ علامہ اقبالؒ اور قائدِ اعظمؒ کی فکر کا ترجمان تھا۔ یقین جانیے! ان کے انتقال سے قوم کو لاتلافی نقصان ہوا ہے۔

(احتشام الحق، فضل جمال سید۔ سید ممتاز شاہ
بورے والہ ضلع وہاڑی)

★ حضرت مفکرِ قرآن جناب غلام احمد پرویز صاحب مرحوم جو کہ بلاشبہ اس صدی کے ایک عظیم مفکر ہیں، کی رحلت کی غم اندوز خبر ٹیلی ویژن کے خبرنامہ میں ۸۵-۲-۲۴ کو سنی۔ یہ خبر ایک فرد کی موت کی نہ تھی کہ سنی ان سنی ایک ہو۔ یہ ایک عظیم مفکر کی خبر تھی۔ اللہ تعالیٰ انہیں اپنی رحمت میں جگہ دے۔

(محمد شفیق الرحمٰن۔ نذیر آباد۔ ملتان)

★ تیری لحد پہ رحمتوں کا ہوتا رہے نزول
حق سے تیرا معاملہ سیدھا رہے، پرویز

(غلام محمد فاروقی۔ ساہیوال)

★ چند روز ہوئے محترم پرویز صاحب کی رحلت کی خبر سنی سخت دلی صدمہ ہوا کہ اس دور میں خیر و بد کی تمیز سکھانے والا ہم سے رخصت ہو گیا۔ آپ نے بہت سی ملّی و دینی خدمات سرانجام دیں جن میں سے آپ کی دینی خدمات زیادہ قابلِ ذکر ہیں۔ آپ نے غور و فکر کی دعوت دے کر اس دور کے نوجوان کو خوابِ غفلت سے بیدار کیا . . . . . آپ سے استدعا ہے کہ پرویز صاحب کے مشن کو جاری رکھیں۔

(محمد اورنگ زیب۔ حسن ابدال)

★ رہنمائے ملتِ اسلامیہ۔ شیدائے قرآن و رسالت اپنے مبارک لبوں سے نورِ قرآنی کی کرنیں بکھیرتے رہے جو آج بھی کہیں نہ کہیں کسی نہ کسی انداز میں اندھیروں کے جگر ضرور چھلنی کرتی ہیں . . . . . ارضِ پاک کے مکین اور دانشور، آزادیٔ ہند کے عوامل میں علامہ پرویز کو کلیدی حیثیت میں پائیں گے۔ انہیں قائدِ اعظمؒ کے دل میں دوسرا قائدِ اعظمؒ بیٹھا نظر آئے گا۔

مجھے تو ایسا لگتا ہے کہ پرویز صاحب وفات نہیں پا گئے۔ وہ اپنے بلند مقام پر ڈٹے ہوئے ہیں اور اسلامی نظام کے احیاء کی شکل میں اپنا خراجِ عقیدت وصول کرتے ہیں۔

قرآنی فکر کے حلقۂ احباب مری کا یہ اجلاس (مورخہ ۲۲ ۳/۸۵) ممتاز مفکرِ قرآن جناب غلام احمد پرویز صاحب مرحوم کی وفات پر انتہائی صدمہ سے دوچار ہے۔ ان کی بیوہ محترمہ اور ان کے بھائی ڈاکٹر عارف بٹالوی صاحب سے اظہارِ تعزیت کرتے ہوئے اس المناک صدمہ میں برابر کا شریک ہے . . . . مرحوم کی قرآنی خدمات تاریخِ انسانی کا ایک گراں قدر حصّہ ثابت ہوں گی

اور انشاء اللہ نوعِ انسانی، قرآنی نظامِ ربوبیت کے سدا بہار گلستان کی ایک جھلک ضرور دیکھ لے گی۔

(ملک حنیف وجدانی۔ عبدالغفار ملک و رفقاء مری ضلع راولپنڈی)

★ میرے محترم میرے احترام شیریں سخن شیریں کلام
اقبال کس کو سناؤں گا کہاں ہوگا اب اپنا قیام
ہمیں چھوڑ کے آپ چلے گئے یہ نہ آپ کا نہ ہمارا بس
کہ نبی ولی بھی نہ بچ سکے حکم اجل پہ خاص و عام
تیری سوچ کو تیرے رنگ کو دیکھا ہے سب نے قریب سے
تیری سوچ مثبت سوچ ہے تیرا رنگ ہے رنگِ دوام
تیرے خُلق کو کردار کو کیسے بھلا سکتا ہوں میں
تیرا خُلق خُلقِ کریم ہے کردار میں اعلےٰ مقام
یہ دُعا ہے ربّ کریم سے قدوس اور رحیم سے
تجھے رکھے اپنی پناہ میں جنّت میں دے اعلیٰ مقام

(نذیر احمد فاروقی آفس سپرنٹنڈنٹ
ڈسٹرکٹ کونسل سیالکوٹ)

★ بوجوہ بہت دیر سے جناب علامہ پرویز صاحب کی وفات سے مطلع ہوا۔ جو دل پر گزری وہ کیا بتاؤں۔ پرویز صاحب کے اقرباء اور دلی دوستوں کو میری جانب سے ہمدردی اور غمگساری کا پیغام پہنچا دیں۔ یہ غم ہم سب کا ہے۔ سارے پاکستان کا ہے۔

(رب نواز۔ سکنہ خرم ضلع کرک)

★ علاّمہ غلام احمد پرویز کے انتقال پر ملال کی اطلاع پاکر سخت صدمہ ہوا۔ اِنّا لِلّٰہِ وَ اِنّا الیہِ راجعون اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ مرحوم کو اپنے جوارِ رحمت میں جگہ دے اور پسماندگان کو صبرِ جمیل اور اس صدمے پر اجرِ عظیم عطا فرمائے۔ آمین۔

(صاحبزادہ سیّد محمد فیروز شاہ اثر گیلانی
بانیٔ مجلسِ رحمان بابا۔ مومند۔ اکبر پورہ۔ ضلع پشاور)

★ مفکّرِ قرآن جناب پرویز صاحب کی وفات کی خبر سُن کر دل کو سخت صدمہ پہنچا۔ خداوند تعالیٰ ان کو ابدی زندگی نصیب کرے۔ جناب مرحوم نے قرآن کے نور سے دنیا کو روشن کرکے مظلوم انسانیت کی ناقابلِ فراموش خدمت کی ہے۔ اور مسلم قوم کو مذہب کی توہم پرستی، سرمایہ داروں کی دسیسہ کاری اور آمریت کے استبداد سے آزادی کی جدوجہد میں بھرپور قیادت کی ہے۔ ہم امید کرتے ہیں کہ ادارہ طلوعِ اسلام مرحوم کے مشن کو جاری رکھ کر دنیا کو قرآن کے نور سے منوّر کرتا رہے گا۔ آمین

(مسعود خان آف شیوہ ضلع مردان)

★ علامہ پرویز کی وفات سے اسلامی دنیا ایک عظیم محقق اور مفکرِ قرآنی سے محروم ہوگئی ہے۔ مرحوم نے قرآنی حقائق پر صدیوں سے پڑے ہوئے غیر قرآنی تصورات کے ان دبیز پردوں کو چاک کیا جن کی وجہ سے صحیح اسلامی نظام آج تک دنیا کے کسی بھی مسلمان ملک میں قائم نہ ہو سکا.....
علامہ پرویز کی تصانیف رہتی دنیا تک جویانِ شوق کے لئے مشعلِ راہ ہوں گی۔ مرحوم نے قرآنی فکر کی جو تحریک شروع کر رکھی تھی اسے جاری رکھنے کے لئے ادارہ طلوعِ اسلام کے احباب کو اپنی کوششیں دوبالا کر دینی چاہئیں۔ میری دعا ہے کہ اللہ تعالےٰ علامہ صاحب کی روح کو اپنی جوارِ رحمت میں جگہ دے اور پسماندگان کو صبرِ جمیل عطا کرے۔ آمین۔

(غلام مصطفیٰ اعوان ایڈووکیٹ ایبٹ آباد)

★ میرے ہم خیال بھائیو اور بہنو! میرا قلم کافی کوشش کے باوجود ملّتِ اسلامیہ کے عظیم سکالر اور مفکرِ قرآن جناب غلام احمد پرویز کے ساتھ مرحوم نہیں لکھ سکتا کیونکہ جب تک پاکستان زندہ رہے گا اس وقت تک علامہ اقبالؒ، قائداعظمؒ اور علامہ پرویزؒ، مرحوم نہیں ہو سکتے۔ وہ صرف چین کی نیند سو گیا ہے۔ لیکن شاہراہِ قرآن پر چلنے والے قافلے کے لئے جس شمع کو علامہ پرویز نے روشن کیا ہے وہ صرف ہمارے لئے نہیں بلکہ آنے والی نسلوں کی رہنمائی کرتا رہے گا۔

(قافلے کا ایک فرد۔ عارف خٹک۔ حصار ننگ ضلع پشاور)

★ قابلِ صد احترام جناب غلام احمد پرویز صاحب اس قدر جلد ہم سے جدا ہو گئے۔ اس بات کا یقین نہیں آتا۔ دل و دماغ کی عجیب کیفیت ہے۔ مرحوم لکھنے کی جسارت قلم نہیں کر پا رہا ہے.... دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ پرویز صاحب کو جنت الفردوس میں جگہ عطا فرمائے اور آپ کو ان کے مشن کو آگے بڑھانے کی توفیق دے۔

(محمد رفیق پشاور شہر)

★ مرحوم پرویز صاحب نے ہمیشہ حق کا پرچار کیا۔ وہ ایسی عظیم شخصیت کے حامل تھے کہ اسلام کے جھوٹے دعویداراُن سے ڈرتے تھے۔ آپ کو ایک مفسّرِ قرآن اور ایک عالم کی حیثیت سے ہمیشہ یاد کیا جائیگا میں دعاگو ہوں کہ خداوندِ پاک پرویز صاحب کی وہ ناختم ہونے والی دنیا گلشن بنا دے اور انہیں اپنے سایۂ رحمت میں جگہ دے۔ آمین۔

(شب نیاز خان بنوں۔ گلنار علی خان)

★ مفکرِ قرآن جناب علامہ غلام احمد پرویز صاحب کی وفات کی خبر ٹیلیویژن پر سن کر ہم میرپور خاص والے دوستوں کو بے حد دکھ ہوا۔ ہماری اللہ تعالےٰ سے دعا ہے کہ وہ انہیں کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے۔ آمین۔

(اشکباران۔ محمد یعقوب۔ منصور۔ عبدالشکور۔ محمد شریف۔ کمال حبیب احمد۔ صوبیدار مشتاق احمد۔ عبدالرحمٰن۔ عبدالرشید آرائیں میرپور خاص)

★ میں اپنے عریضے میں ہمیشہ یہ الفاظ لکھتا تھا۔ محترم قبلہ باباجی! سلام و رحمت" مگر وہ ہستی آج ہم میں موجود نہیں .... ہمارے قائدؒ کے ساتھی۔ اقبالؒ کے اور قرآن کے شارح، ہمیں تنہا چھوڑ گئے۔ اللہ انہیں غریقِ رحمت کرے۔

(علی حسین۔ گدو (کشمور) سندھ)

★ یہ جان کر کہ محترم علامہ غلام احمد پرویز صاحب اس دارِ فانی سے رحلت کر گئے، بہت دُکھ ہوا ہے۔ میں ایسے محسوس کرتا ہوں جیسے میرا کوئی سرپرست فوت ہوگیا ہو۔ اور اب میں یتیم ہوگیا ہوں۔ علامہ صاحب مسلم دنیا کے سرمایہ تھے۔ قائداعظمؒ کے ساتھی تھے۔ پاکستان کے بارے میں صحیح فکر کے مالک تھے۔ عظیم دانشور اور بہت بڑے عالم قرآن تھے جس کی جدائی میں ہر مسلمان خون کے آنسو بہاتا ہے۔ مسلم اُمّہ کو علامہ پرویز کے جانے سے بہت بڑا اور ناقابلِ تلافی نقصان ہوا ہے۔

(پیر سید نور شاہ جیلانی پالا اولڈ ضلع حیدرآباد سندھ)

★ مفکرِ قرآن جناب پرویز صاحب کے انتقال کا پیغام ملا اور ہم کو یہ پڑھ کر بڑا دُکھ ہوا ہے۔ امید ہے تمام احباب اس صدمہ کو ہمت اور حوصلہ سے برداشت کریں گے۔ اور ہم آپ کے اس دُکھ میں برابر کے شریک ہیں۔

(گلاب ہکڑو۔ گوٹھ سلطان چانگ۔ سندھ)

★ یہ خبر سن کر کہ غلام احمد پرویز صاحب کا انتقال ہوگیا۔ بے حد افسوس ہوا۔ اللہ تعالیٰ پسماندگان کو صبرِ جمیل عطا فرمائیں اور مرحوم کو جوارِ رحمت میں جگہ ملے۔

(محمد ادریس میمن میرپور خاص۔ تھرپارکر سندھ)

★ علامہ پرویز صاحب کی وفات نے ہمیں مفلوج کر دیا ہے۔ وہ ہمارے درمیان نہیں رہے، لیکن اللہ تعالیٰ انہیں اپنے جوارِ رحمت میں جگہ دیں۔ ہم سب دل کی گہرائیوں سے ان کی مغفرت کے لئے دست بدعا ہیں اور پسماندگان کے غم میں شریک (برقیہ)

(مولانا عثمانی، اسماعیل عابد۔ عبدالصمد۔ عبدالقادر۔

اے ایس کے جُمّل جوہنسبرگ جنوبی افریقہ)

★ محترم باباجی کی وفات کی خبر نے ہم پر گہرا اثر ڈالا ہے۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ کن الفاظ میں بیان کریں۔ ہم اپنے مال و جان سے تحریکِ طلوعِ اسلام کے ساتھ ہیں۔

(بزمِ طلوعِ اسلام فریڈرک سٹڈ ناروے)

★ ۲۵ اور ۲۶ فروری کی درمیانی شب کو ایک دوست کی زبانی یہ المناک خبر سنی کہ ریڈیو پاکستان کی عالمی سروس کے مطابق مفکرِ قرآن محترم پرویز صاحب ہم سے ہمیشہ کے لئے جدا ہو گئے ہیں۔ اِنّا للہ و انا الیہ راجعون۔ نہ چاہتے ہوئے بھی اس حقیقت کو تسلیم کرنا پڑا کہ بالآخر وہ چراغ گُل ہوگیا۔

جو نصف صدی سے زائد عرصہ تک عالم اسلام کو روشن کئے ہوئے تھا ..... اللہ پاک مرحوم کو اپنے جوارِ رحمت میں جگہ عطا فرمائے اور آپ سب کو صبرِ جمیل عطا کرے۔

خدا کرے کہ ان کا روشن کیا ہوا چراغ "طلوع اسلام" بدستور روشنی پھیلاتا رہے۔ آمین۔

(شیخ اسماعیل نیروبی)

★ محترم باباجی پرویز صاحب کی وفات کا سن کر بے پناہ صدمہ ہوا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کسی نے مار مار کر ادھ مؤا کر دیا ہے۔ ذہن پر ایک بوجھ سا ہے ..... دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کو اپنے جوارِ رحمت میں جگہ عطا فرمائے اور وہ جنت کی بہاروں میں رہیں۔

ع دعا ہے کہ اے مالک دو جہاں
جنت میں کر ان کا بھی آشیاں

(محمد صدیق بٹ۔ ٹورنٹو کینیڈا)

★ ع موت عالِم کی ہے اک عالَم کی موت
آہ! پھر اس علم کے قاسم کی موت
بات جب بھی ہو گی رستاخیز کی
سامنے آئے گی راہ پرویز کی

(غلام احمد پرویزؔ دانا۔ ۱۴۰۵)

(حافظ محمد ابراہیم اوسلو۔ ناروے)

★ مارچ ۱۹۸۵ء کا طلوعِ اسلام ملا۔ اس میں محترم پرویز صاحب کے انتقال کر جانے کی خبر پڑھی تو دل پھٹ گیا۔ پاکستان کے لئے بہت ہی قیمتی ہستی تھی جو اس دنیا سے چلی گئی۔ ان کے چلے جانے سے جو نقصان ملتِ پاکستانیہ کو ہوا وہ کبھی پورا نہیں ہو سکتا۔ وہ شمعِ روشن تھی جس کی روشنی دھیرے دھیرے پھیل رہی تھی۔ وہ دیا گُل ہو گیا جس کا بے حد افسوس ہے ..... جو انہوں نے دینِ اسلام کے لئے کیا ہے۔ قوم اس کو کبھی فراموش نہیں کر سکتی۔

(ایم شفیق۔ سکاٹ لینڈ)

★ باباجی کے اس جہانِ فانی سے وفات پانے کی خبر مل چکی تھی۔ مگر یقین نہیں آتا تھا۔ آخر کار ماہِ مارچ کے طلوعِ اسلام ملنے پر اس خبر کی تصدیق ہو گئی ہے۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْن اللہ تعالیٰ باباجی کو جنت الفردوس میں جگہ عنایت فرمائے۔

(محمد امجد بٹ دولتہ قطر)

★ پرویز صاحب کی وفات کی خبر، ہم دور کے باسیوں کے لئے اس قدر بھاری صدمہ کا باعث بنی کہ ہم تصویرِ الم دکھائی دینے لگے۔ الفاظ ہمارے جذبات کو بیان کرنے سے قاصر ہیں۔ اس صدمہ سے عہدہ برآ ہونے میں ابھی وقت لگے گا ..... اس وقت ہم سب کو حوصلہ اور ہمت کی ضرورت

ہے تاکہ ہم اس قرآنی طرزِ تفکر کی نشر و اشاعت کو جاری رکھ سکیں جسے پرویز صاحب مرحوم نے شروع کیا تھا۔

(خالد و رفقاء مسقط)

★ اپنے پیارے باباجی کی رحلت فرمائی کا سن کر دل کو تکلیف و صدمہ ہوا۔ کتنے شفیق اور نیک دل تھے ہمارے بابا جان۔ انکی دلی خواہش تھی کہ وہ ہم جیسے طالب علموں کے لئے ایک ایسا مکتب بنا سکیں جہاں ہمیں قرآن پڑھایا جائے۔ قرآنی تعلیم دی جائے اور ہمیں قرآنی قالب میں ڈھالا جائے ..... میرے دوست اب آپ پر اور ہم سب پر ایک بہت بڑی ذمہ داری عائد ہوتی ہے کہ ہم اپنے باباجان کی خواہش کے مطابق اس منزل تک پہنچنے کے لئے اپنی رفتار کو مزید تیز کر دیں اور ثابت کر دیں کہ واقعی ہم ان سے دلی پیار کرتے ہیں۔

(رشید فاروقی۔ انگلینڈ)

★ میں ماہِ رواں کے پرچہ کی شدتِ انتظار میں کھڑا ڈاکیے کو دیکھ رہا تھا کہ اتنے میں وہ آگیا اور خاکی کاغذ میں لپٹا ہوا "قرآنی نظامِ ربوبیت کا پیامبر" میرے ہاتھوں میں جوں ہی آیا، اسے چوما اور سینے سے لگایا۔ میری ساری زندگی جو پرچہ طلوعِ اسلام کے پڑھنے میں گذری، یہ پہلا موقعہ تھا کہ میں نے مقدس پرچے کو بوسہ دیا۔ مجھے یہ خبر نہ تھی کہ میرا یہ پیار میری محبت بھری خوشی کو غمی میں بدل دیگا۔ ایسی غمی جس نے مرد و زن اور بوڑھوں کو تو ایک طرف، معصوم بچوں کو جھنجوڑا اور تڑپا کر رکھ دیا۔

بانئ طلوعِ اسلام (مفکرِ قرآن پرویز صاحب) بانئ پاکستان حضرت قائداعظمؒ کے پرخلوص ساتھی اور قرآنی مشیر تھے جنہوں نے تحریکِ پاکستان کے دوران اپنے زورِ آورِ قلم اور تدبرِ قرآنی سے نیشنلسٹ علماء حضرات کا کامیاب مقابلہ کیا .... یہ حقیقت ہے جو میری شنید نہیں چشم دید ہے ..... دعا ہے کہ مرحوم کی روح پھول کی طرح جنت کی گلیوں کو معطر کرتی رہے۔ آمین۔

(شریکِ غم نواز کھیوی برمنگھم۔ انگلینڈ)

★ محترم باباجی کے رحلت فرما جانے کا ہمیں بڑا افسوس ہے۔ لیکن اس صدمہ نے ہمیں ایک نئی ہمت و جرأت اور توانائی عطا کی ہے۔ اب ہم زیادہ گرم جوشی سے چلیں گے تاکہ ہم محترم باباجی کے مشن کو اور تیزی سے آگے بڑھا سکیں اور قرآنِ کریم کی تعلیم کو اور زیادہ عام کر سکیں ...... مرحوم کی ۸۲ سالہ زندگی کا ایک ہی پیغام تھا کہ اگر حقیقی زندگی سے ہمکنار ہونا چاہتے ہو تو خدا کی اس عظیم ترین کتاب (قرآن کریم)، جو ہر لحاظ سے مکمل، غیر متبدل اور پوری طرح محفوظ ہے، کی رسّی کو دوبارہ تھام لو تاکہ تمہارے ہر عمل کا نتیجہ اس دنیا کی جنت کی شکل میں بھی تمہارے سامنے آجائے اور تم دنیا میں ایک غالب قوم کی حیثیت سے جی سکو۔

(امجد محمود نمائندہ بزمِ طلوعِ اسلام۔ اوسلو۔ ناروے)

حرام کی کمائی

ایک مسلمان کتنا ہی گیا گزرا کیوں نہ ہو۔ اس کے اخلاق بھی خراب ہوں۔ وہ احکامِ شریعت کی اطاعت بھی نہ کرتا ہو۔ وہ نماز روزے کا بھی پابند نہ ہو۔ وہ فاسق و فاجر ہو۔ حتیٰ کہ وہ زانی اور شرابی بھی کیوں نہ ہو۔ ایک بات ایسی ہے جس کا وہ نہایت سختی سے پابند ہو گا۔ وہ یہ کہ سؤر (کے گوشت) کو حرام سمجھے گا۔ وہ اسے کبھی نہیں کھائے گا۔[1] اس پر ہزار سختی کی جائے یا کتنا ہی بڑا لالچ کیوں نہ دیا جائے، وہ اس کے قریب تک نہ جائے گا۔ سؤر کے گوشت کا کھانا تو ایک طرف، وہ اس کا نام تک سننا گوارا نہیں کرے گا۔ اس کے تصور سے اسے جھرجھری آ جائے گی۔ اگر اسے کہا جائے کہ تم نے فلاں بدمعاملگی کی ہے تو وہ (اپنی صفائی میں) بلا ساختہ کہے گا کہ میرے لئے تو ایک پیسہ بھی سؤر کے برابر ہے۔

سوال یہ ہے کہ جس طرح سؤر کے متعلق ہمارا ردِّ عمل یہ ہے، کیا ناجائز کمائی کے متعلق بھی ہمارا ردِّ عمل اسی قسم کا ہے؟ بالکل نہیں۔ قطعاً نہیں۔ حالانکہ جس خدا نے سؤر کے گوشت کو حرام قرار دیا ہے اسی نے ناجائز کمائی کو بھی حرام قرار دیا ہے۔ تو کیا یہ امر موجبِ حیرت نہیں کہ ایک حرام کے متعلق تو اس قدر شدید ردِّ عمل اور دوسرے حرام کے خلاف ردِّ عمل تو کیا، اس کے حرام ہونے کا ہمیں احساس تک نہیں ہوتا؟ سؤر کا گوشت تو ایک طرف رہا۔ اگر کسی ہوٹل کے متعلق شبہ ہو جائے کہ اس میں کباب، سؤر کی چربی میں تلے جاتے ہیں، تو اس ہوٹل کی اینٹ سے اینٹ بجا دی جائے۔ لیکن وہی لوگ ساری ناجائز کمائی سے اپنا پیٹ بھرتے رہتے ہیں اور انہیں کبھی اس کا احساس نہیں ہوتا کہ ہم حرام کھا رہے ہیں۔ ناجائز کمائی میں بعض صورتیں ایسی بھی ہوتی ہیں جنہیں حکومت کا مروّجہ قانون جرم قرار دیتا ہے۔ اس قسم کی کمائی کے متعلق یہ تو کہا جائے گا کہ ایسا کرنا جرم ہے۔ یہ نہیں سمجھا جائے گا کہ ایسا کرنا "حرام" (یا گناہ) ہے۔ اور اگر معاشرہ میں جرائم عام ہو جائیں تو اس کمائی کے جرم ہونے کا احساس بھی مٹ جائے گا۔ ناجائز کمائی کی بعض صورتیں ایسی ہوں گی جنہیں مروّجہ قانونِ حکومت جرم قرار

---

[1] ہمیں معلوم ہے کہ بعض ممالک کے مسلمان اس معاملہ میں ایسے متشدد نہیں رہتے۔ ہمیں ان سے سروکار نہیں۔ پاکستان میں ہنوز ویسی صورت پیدا نہیں ہوئی اور ہمارے اس وقت کے مخاطب بھی اہلِ پاکستان ہیں۔

نہیں دیتا۔ اس سے اجتناب برتنے کا احساس تک نہیں ہوگا۔

لیکن جس خدا پر ایمان لانے سے ہم مسلمان کہلاتے ہیں۔ اس نے حرام اور حلال اور جائز و ناجائز کا معیار کچھ اور بنایا ہے۔ آیئے ہم دیکھیں کہ وہ معیار کیا ہے۔

باطل کی کمائی

قرآنِ مجید کی دو اصطلاحیں بڑی بنیادی ہیں۔ یعنی حق اور باطل۔ قرآنِ کریم آمدنی کے جن ذرائع کو جائز قرار دیتا ہے، وہ آمدنی حق کے مطابق اور حلال ہے۔ جن ذرائع کو وہ ناجائز ٹھہراتا ہے، وہ آمدنی باطل اور حرام ہے۔ حرام اور حلال کا یہ بنیادی معیار ہے۔

قرآن مجید سورۂ بقرہ کی آیت ۱۸۳ - ۱۸۷ میں روزوں کے احکام ہیں۔ روزہ کے معانی یہ ہیں کہ ایک مسلمان روزہ کی حالت میں خدا کے حکم کے مطابق ان چیزوں کو بھی اپنے اوپر حرام قرار دے لیتا ہے جنہیں خدا نے عام حالات میں حلال قرار دیا ہے۔ وہ خدا کے اس حکم کی اس شدّت سے پابندی کرتا ہے کہ سخت سے سخت گرمی میں انتہائی پیاس کی حالت میں کمرے کے اندر تنہا بیٹھے ہوئے جب کوئی دیکھنے والا نہیں ہوتا، پانی کا ایک قطرہ بھی حلق میں نہیں ٹپکاتا۔ لیکن روزوں کے احکام کے بالکل ملحق آیت (۲/۱۸۸) میں اسی خدا نے یہ حکم دیا ہے کہ:

وَلَا تَأْكُلُوٓا اَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ ه (۲/۱۸۸)

ایک دوسرے کا مال باطل طریق سے نہ کھاؤ۔

"بے روزہ" تو ایک طرف، وہ روزہ دار جو مرتا مر جائے گا لیکن پانی کا ایک گھونٹ نہیں پیئے گا، باطل کی کمائی کے متعلق خدا کے اس حکم کی کچھ پرواہ نہیں کرے گا۔ وہ روزہ کی حالت میں بھی ایسی کمائی کرنے میں مصروف رہے گا! ہمارے ہاں روزوں کے احکام کو آیت (۲/۱۸۷) تک محدود رکھا جاتا ہے۔ ان آیات میں آیت (۲/۱۸۸) کو شامل نہیں کیا جاتا۔ لیکن روزہ میں بھی تو مسلمانوں کو اس امر کی مشق کرائی جاتی ہے کہ جن چیزوں کو چھوڑنے کا خدا حکم دے، وہ انہیں بلا تامّل چھوڑ دے، خواہ وہ حلال ہی کیوں نہ ہوں۔ لیکن ہماری یہ پابندی صرف کھانے پینے کی چیزوں تک محدود رہتی ہے۔ ناجائز کمائی کو اس میں شامل نہیں کیا جاتا۔ بالکل اسی طرح، جیسے سؤر کھانے کو تو حرام سمجھا جاتا ہے لیکن ناجائز کمائی کو حرام نہیں سمجھا جاتا۔

قرآنِ کریم بنی اسرائیل (یہودیوں) کی تباہی کا ایک بنیادی سبب یہ بتاتا ہے کہ: اَكْلِهِمْ اَمْوَالَ النَّاسِ بِالْبَاطِلِ۔ (۴/۱۶۱) "وہ لوگوں کا مال ناجائز طریق سے کھا جاتے تھے"۔ اس کے آگے ہے۔ وَاَعْتَدْنَا لِلْكٰفِرِيْنَ مِنْهُمْ عَذَابًا اَلِيْمًا۔ (۴/۱۶۱) "ان میں سے جو اس جرم کے مرتکب ہوتے تھے، وہ کافر تھے اور ان کے لئے سخت عذاب کی وعید کی گئی تھی"۔ — اس سے ظاہر ہے کہ ناجائز

کمائی کرنا، کفر کے مرادف اور عذاب جہنم کا موجب ہے ـــــ سوچئے کہ اس ناجائز کمائی کے خلاف اس سے زیادہ واضح اور سخت تہدید اور کیا ہو سکتی ہے!

باطل (ناجائز) کمائی کے بہت سے گوشے ہیں مثلاً، دغا، فریب، رشوت، چوری، خیانت دھاندلی، گراں فروشی، چور بازاری وغیرہ، لیکن اللہ تعالیٰ نے ایک ایسے گوشے کا ذکر خاص طور پر کیا ہے جس کی طرف عام طور پر ہماری نگاہ نہیں جاتی۔ اس نے کہا ہے۔

احبار و رہبان

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِنَّ كَثِيرًا مِّنَ الْأَحْبَارِ وَالرُّهْبَانِ لَيَأْكُلُونَ أَمْوَالَ النَّاسِ بِالْبَاطِلِ وَيَصُدُّونَ عَن سَبِيلِ اللَّهِ (9/34)

اے جماعت مومنین! (یاد رکھو) علماء اور مشائخ میں سے اکثریت کی یہ حالت ہے کہ وہ لوگوں کا مال ناجائز طریق سے کھاتے ہیں اور انہیں اللہ کی طرف جانے والی راہ سے روکتے ہیں۔

علامہ شبیر احمد عثمانیؒ اس کی تشریح کرتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

یعنی (وہ) روپیہ لے کر احکام شرعیہ اور اخبار الٰہیہ کو بدل ڈالتے ہیں۔ ادھر عوام الناس نے انہیں، جیسے پہلے گذرا، خدائی کا مرتبہ دے رکھا ہے۔ جو کچھ غلط سلط کہہ دیں وہی ان کے نزدیک حجت ہے۔ اس طرح علماء و مشائخ نذرانے وصول کرنے، ٹکے بٹورنے اور اپنی سیادت و ریاست قائم رکھنے کے لئے عوام کو مکر و فریب کے جال میں پھنسا کر راہ حق سے روکتے رہتے ہیں۔ کیونکہ عوام اگر ان کے جال سے نکل جائیں اور دین حق اختیار کر لیں تو ساری آمدنی بند ہو جائے۔

(حاشیہ شیخ الہند، مولانا محمود الحسنؒ۔ ص۲۴۸)

خبیث اور طیّب

جائز اور ناجائز کمائی کے سلسلہ میں، قرآن مجید میں اور اصطلاحات بھی آئی ہیں۔ مثلاً ـــ طیّب اور خبیث ـــ حق و باطل کی طرح یہ اصطلاحات بھی بڑی جامع ہیں لیکن موضوع زیر نظر کی رُو سے، ان کا مفہوم بھی جائز اور ناجائز لیا جانا زیادہ مناسب ہے۔ اللہ تعالیٰ نے حضور نبی اکرمؐ کی بعثت کا ایک مقصد جلیلہ یہ بتایا ہے کہ:۔

وَيُحِلُّ لَهُمُ الطَّيِّبَاتِ وَيُحَرِّمُ عَلَيْهِمُ الْخَبَائِثَ ۝ (7/157)

وہ لوگوں کے لئے طیّبات کو حلال اور خبائث کو حرام قرار دے گا۔

قرآن کریم کے اس واضح ارشاد کے مطابق، جائز کمائی طیّب یعنی حلال ہے اور ناجائز کمائی خبیث

یعنی حرام۔ یعنی بلفظ (حرام) لحم خنزیر (سؤر کے گوشت) کے متعلق آیا ہے۔ (5/4) لہذا ایک مسلمان کے لئے سؤر اور ناجائز کمائی میں ذرا بھی فرق نہیں۔ دونوں یکساں حرام ہیں۔ اسی لئے فرمایا کہ: لَا يَسْتَوِي الْخَبِيثُ وَالطَّيِّبُ وَلَوْ أَعْجَبَكَ كَثْرَةُ الْخَبِيثِ ج.. (5/101) " چونکہ ناجائز طریق سے انسان چند دنوں میں لاکھوں پتی ہو جاتا ہے۔ اس لئے ہر شخص لپک کر اس کی طرف جاتا ہے۔ لیکن (مسلمانو! تمہیں یاد رکھنا چاہیئے کہ) جائز، اور ناجائز کمائی کبھی ایک جیسی نہیں ہوسکتی، اسی طرح جیسے حلال اور حرام، ایک جیسے نہیں ہوسکتے۔

قرآن مجید نے خبیث و طیب (جائز اور ناجائز) کی کئی مثالیں دی ہیں۔ ان میں سے ایک مثال یہ ہے کہ:-

وَآتُوا الْيَتَامَىٰ أَمْوَالَهُمْ وَلَا تَتَبَدَّلُوا الْخَبِيثَ بِالطَّيِّبِ وَلَا تَأْكُلُوا أَمْوَالَهُمْ إِلَىٰ أَمْوَالِكُمْ إِنَّهُ كَانَ حُوبًا كَبِيرًا ۝ (4/2)

اور یتیموں کو ان کا مال اسباب ٹھیک ٹھیک دیا کرو۔ ایسا نہ کرو کہ ان کی طیب چیزوں کو رکھ لو اور ان کے بدلے اپنی خبیث چیزیں انہیں دے دو۔ نہ ہی ان کے مال اور اپنے مال کو ملا کر گڈمڈ کرو۔ یاد رکھو! ایسا کرنا سخت بے انصافی کی بات اور وبالِ عظیم کا باعث ہے۔

"یتیم" سے بالعموم وہ بچے مراد ہوتے ہیں جن کا باپ فوت ہو جائے۔ یہ بھی ٹھیک ہے، لیکن اس کے بنیادی معنی ہر وہ شخص ہے جو معاشرہ میں تنہا، بے یار و مددگار رہ جائے۔ مندرجہ بالا حکم میں اس قسم کے تمام افراد شامل ہیں۔ چنانچہ علامہ شبیر احمد عثمانیؒ اس کی تفسیر میں فرماتے ہیں۔ "ان احکام میں بیٹوں کے حکم کو شاید اس لئے مقدم بیان فرمایا کہ یتیم بے سروسامانی اور مجبوری اور بے چارگی اور بے کسی کے باعث، رعائت اور حفاظت اور شفقت کا نہایت محتاج ہے"۔ (ایضاً ص99) اس سے واضح ہے کہ جو لوگ معاشرہ میں بے سروسامان، کمزور، مجبور، بے چارہ اور بے کس ہوں۔ ان کی بے کسی اور بے چارگی سے ناجائز فائدہ اٹھا کر کچھ حاصل کرنا، خبیث (حرام) ہے۔ آگے چل کر کہا کہ اس طرح حاصل کردہ مال کے متعلق یوں سمجھو کہ وہ لوگ اپنے پیٹ میں جہنم کی آگ بھر رہے ہیں۔ (4/10) یاد رکھئے تمیز یہ بات سمجھ میں آجائے گی کہ اکثر و بیشتر حالات میں ناجائز کمائی، دوسروں کی مجبوری' بے چارگی، بےکسی اور بے بسی سے فائدہ اٹھا کر حاصل کی جاتی ہے۔ ایسی کمائی قطعاً حرام ہے۔

رشوت

آج کل حرام کمائی میں رشوت کا نام سرفہرست آتا ہے۔ اس کا چلن ایسا ہوگیا ہے کہ آپ نے اچھے اچھے لوگوں کو یہ کہتے سنا ہوگا کہ کیا کیا جائے آج کل رشوت کے بغیر کوئی چارہ ہی نہیں۔ روزوں کے احکام کے تسلسل میں ایک آیت (2/188) کا ایک حصّہ پہلے درج کیا جاچکا ہے۔ پوری آیت

یوں ہے :۔

وَلَا تَأْكُلُوٓا أَمْوَالَكُم بَيْنَكُم بِالْبَاطِلِ وَتُدْلُوا بِهَآ إِلَى الْحُكَّامِ لِتَأْكُلُوا فَرِيقًا مِّنْ أَمْوَالِ النَّاسِ بِالْإِثْمِ وَأَنتُمْ تَعْلَمُونَ (۲/۱۸۸)

آپس میں ایک دوسرے کا مال ناجائز طریق سے مت کھاؤ۔ نہ ہی اسے بطور رشوت حکام تک اس مقصد کے لئے پہنچاؤ کہ کسی دوسرے کے مال میں سے تمہیں وہ مل جائے جس کے متعلق تم جانتے ہو کہ تم اس کے حقدار نہیں ہو۔

کس قدر صاف اور واضح ہے یہ حکم خداوندی۔ آج کون نہیں جانتا کہ رشوت حرام ہے لیکن اس کے باوجود جانتے بوجھتے اس کا چلن عام ہو رہا ہے۔ حیرت ہے کہ سوٗد کو حرام سمجھ کر اس سے مجتنب رہنے والے، رشوت کا مال کس طرح بلا غل و غش ہڑپ کرتے رہتے ہیں :۔

کاروباری دنیا

رشوت کا تعلق تو پھر بھی ایک مخصوص حلقہ سے ہے۔ یعنی ان لوگوں سے جنہیں دوسروں کو فائدہ پہنچانے کا کچھ اختیار اور اقتدار حاصل ہوتا ہے۔ لیکن جس راستے سے حرام کی کمائی سیلاب کی طرح امڈ کر آتی ہے وہ کاروبار کا میدان ہے۔ "کاروبار" میں تجارت، لین دین، خرید و فروخت بھی شامل ہے اور ملیں اور فیکٹریاں بھی، جن میں محنت کشوں اور کارخانہ داروں کا باہمی تعلق ہوتا ہے۔ اس میدان میں ناجائز کمائی کے بے تحاشا امکانات کے پیشِ نظر قرآنِ مجید نے مختلف انداز سے احکامات دیئے ہیں۔ سب سے پہلے عام تجارت کو لیجئے۔ فرمایا :۔

يَآ أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَأْكُلُوٓا أَمْوَالَكُم بَيْنَكُم بِالْبَاطِلِ إِلَّآ أَن تَكُونَ تِجَارَةً عَن تَرَاضٍ مِّنكُمْ ۚ وَلَا تَقْتُلُوٓا أَنفُسَكُمْ ۚ إِنَّ اللَّهَ كَانَ بِكُمْ رَحِيمًا (۴/۲۹)

اے جماعت مومنین! تم ایک دوسرے کا مال ناجائز طریق سے مت کھاؤ۔ معاشرتی زندگی میں روزمرہ کی اشیاء ضروریہ کی خرید و فروخت ناگزیر ہوتی ہے۔ اس کے لئے جائز طریق یہ ہے کہ خریدار، دکاندار کی منہ مانگی قیمت دینے پر مجبور نہ ہو۔ بلکہ یہ، گاہک اور دکاندار کی باہمی رضامندی سے ہو، اگر تم ایسا نہیں کرو گے تو یہ دوسروں کو قتل کر دینے کے مرادف ہوگا۔ خدا تمہیں از راہ ترحم قتل و غارت گری سے بچانا چاہتا ہے۔

اس آیۂ جلیلہ میں خرید و فروخت کا ایک ایسا عظیم اصول بیان کیا گیا ہے جس سے سارا مسئلہ حل ہو جاتا ہے اور وہ ہے، "باہمی رضامندی سے تجارت" اس سلسلہ میں جو کچھ آجکل ہو رہا ہے اس پر ایک نگاہ ڈالئے۔ دکاندار (خواہ وہ تھوک فروش ہوں یا خوردہ فروش) ایک تنظیم قائم کر لیتے ہیں جس کی رو سے وہ فیصلہ کر لیتے ہیں کہ فلاں چیز اتنے داموں میں بیچی جائے گی۔ صاحبِ ضرورت

بازار (یا منڈی) میں پہنچتا ہے۔ دکاندار اسے مطلوبہ چیز کی قیمت بتاتا ہے۔ خریدار دیکھتا ہے کہ قیمت بہت زیادہ ہے۔ وہ کچھ کم کرنے کو کہتا ہے تو جواب ملتا ہے کہ "میں تو اتنے ہی میں دوں گا۔ آپ کو کہیں اور سے سستی ملتی ہے تو وہاں سے لے لیجئے"۔ خریدار مختلف دکانوں سے دریافت کرتا ہے تو اُسے وہی قیمت بتائی جاتی ہے۔ فرمائیے کہ وہ، اس کے بعد کیا کرے؟ اسے اس چیز کی ضرورت ہے اس لئے وہ اسے انہی داموں خریدنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ دکانداروں سے پوچھئے تو وہ نہایت دھڑلے سے کہتے ہیں کہ صاحب! ہم کسی کی جیب نہیں کاٹتے۔ چوری نہیں کرتے۔ ڈاکہ نہیں ڈالتے۔ گاہک کو قیمت بتاتے ہیں اور اسے اختیار ہوتا ہے کہ وہ اسے خریدے یا نہ خریدے۔ یہ قرآن مجید کے ارشاد کے عین مطابق ہے جس کی رو سے اُس نے تِجَارَةً عَنْ تَرَاضٍ مِّنْكُمْ کو حلال قرار دیا ہے۔

اس جواب میں اس کے سوا کیا کہا جائے جو اللہ تعالیٰ نے فرمایا تھا کہ: يُضِلُّ بِهِ كَثِيرًا وَيَهْدِي بِهِ كَثِيرًا (2/26) "اسی قرآن سے اکثر لوگ گمراہ ہو جاتے ہیں اور اسی سے اکثر صحیح راستہ اختیار کرتے ہیں"۔ جس قسم کی تجارت کا ذکر اوپر کیا گیا ہے (اور جسے آج کل قطعاً ناجائز یا معیوب نہیں سمجھا جاتا) اُسے قرآن کے حکم کے مطابق قرار دینا، ضلالت (خود فریبی) نہیں تو اور کیا ہے۔ اگر یہ دکاندار (مثلاً) سبزی فروش ہے تو اس سے پوچھئے کہ جب تم قصاب سے گوشت خریدتے ہو اور وہ ایسا نرخ بتاتا ہے کہ جسے تم نامناسب سمجھتے ہو، لیکن اس کے باوجود تم اس نرخ پر گوشت خریدنے پر مجبور ہوتے ہو، تو کیا تم اسے "باہمی رضامندی سے تجارت" قرار دیتے ہو! قصاب کی روش کو تو تم ظلم وزیادتی سمجھتے ہو اور اس کے خلاف واویلا مچاتے ہو لیکن اپنی اسی قسم کی روش کو بالکل جائز قرار دیتے ہو!

قرآن کریم نے اس قسم کی تجارت کو کاروبار نہیں بلکہ قتل و غارت گری قرار دیا ہے وَلَا تَقْتُلُوا أَنْفُسَكُمْ (4/29)۔ اور جیسا کہ معلوم ہے قتل، عدالتِ خداوندی میں سنگین ترین جرم ہے۔ اسی لئے اگلی آیت میں ہے:

وَمَنْ يَفْعَلْ ذَٰلِكَ عُدْوَانًا وَظُلْمًا فَسَوْفَ نُصْلِيهِ نَارًا ۚ وَكَانَ ذَٰلِكَ عَلَى اللَّهِ يَسِيرًا (4/30)

خدا نے بات واضح طور پر سمجھا دی ہے۔ اگر تم اس کے بعد بھی ایسا ہی کرتے ہو تو اس کا مطلب یہ ہے کہ تم دیدہ دانستہ احکامِ خداوندی سے سرکشی برتتے اور ظلم اور زیادتی کرتے ہو۔ اس کی سزا جہنم ہے۔ عدالتِ خداوندی سے اس قسم کی سزا کا ملنا کچھ بھی مشکل نہیں۔

چونکہ اس قسم کی تجارت میں، اشیائے ضروریہ کے تیار کرنے یا پیدا کرنے والے، تھوک فروش اور خوردہ فروش سب شامل ہوتے ہیں، اس لئے تجارتِ عادلہ ایک خاص نظام کے تحت ہی عمل میں آسکتی ہے۔ یعنی ایسا انتظام جس کی رو سے، ہر شے کا ہر اسٹیج پر منافع مقرر ہو اور اس

کے بعد اس کا انتظام ہو کہ ہر ضرورت مند کو مقررہ قیمت پر مطلوبہ چیز مل جائے۔ اسے کہا جائیگا تِجَارَةً عَنْ تَرَاضٍ مِّنْكُمْ۔ یہی منافع حلال ہوگا۔

ربٰوا

قرآنِ کریم نے بیع کو حلال اور ربٰوا کو حرام قرار دیا ہے۔ (وَاَحَلَّ اللّٰهُ الْبَيْعَ وَحَرَّمَ الرِّبٰوا ۲/۲۷۵)۔ ربٰوا کی بحث تفصیل طلب ہے جس کا یہ موقع نہیں۔ (میں اس کے متعلق تفصیل سے بہت کچھ لکھ چکا ہوں) اس وقت میں ربٰوا (سود) کی اس ابتدائی شکل کو لیتا ہوں جس میں ایک ضرورت مند، قرض دینے والے کو سود (یا بیاج) دینے پر مجبور ہوتا ہے۔ اس کی مجبوری سے فائدہ اٹھا کر، قرض خواہ جو کچھ وصول کرتا ہے، قرآن مجید اسے حرام قرار دیتا ہے۔ اسی لئے وہ کہتا ہے کہ اگر تم اس روش سے باز آ جاؤ تو صرف اپنا اصل زر وصول کر سکتے ہو۔ اس سے لَا تَظْلِمُوْنَ وَلَا تُظْلَمُوْنَ (۲/۲۷۹) نہ تم پر ظلم و زیادتی ہوگی کہ تمہارا اصل نہیں مل جائے گا۔ اور نہ ہی مقروض پر کوئی زیادتی کہ اسے اپنی مجبوری کے ماتحت زیادہ نہیں دینا پڑے گا۔

قرآن کریم کے اس اصول کے مطابق دیکھئے کہ اس نے جو، بیع کو حلال کیا ہے اور ربٰوا کو حرام، تو اس میں بنیادی نکتہ ہی یہ ہے کہ جو کچھ کسی سے اس کی مجبوری کا فائدہ اٹھا کر وصول کیا جائے وہ حرام ہے۔ اگر بیع میں بھی ایسا ہوتا ہے تو وہ بیع، بیع نہیں رہتی، ربٰوا ہو جاتی ہے۔ اس اعتبار سے تو مروجہ معاشیات میں پوری کی پوری تجارت، ربٰوا میں شامل ہو جاتی ہے۔ اور ایک تجارت پر ہی کیا موقوف ہے۔ آج زندگی کا کونسا معاملہ ہے جس میں دوسرے کی مجبوری کا ناجائز فائدہ نہیں اٹھایا جاتا؟

میزان

قرآن کریم نے میزان کو بڑی اہمیت دی ہے۔ بنیادی طور پر اس نے کہا ہے کہ کارگہِ کائنات میزان کے سہارے چل رہا ہے۔ وَالسَّمَآءَ رَفَعَهَا وَوَضَعَ الْمِيْزَانَ (۵۵/۷) خدا نے ایسے قوانین وضع کر دیئے ہیں جن کی رُو سے آسمانی کرّوں میں باہمی توازن قائم رہتا ہے۔ اَلَّا تَطْغَوْا فِى الْمِيْزَانِ وَاَقِيْمُوا الْوَزْنَ بِالْقِسْطِ وَلَا تُخْسِرُوا الْمِيْزَانَ (۵۵/۸-۹) اس لئے تم بھی اپنے معاشرہ میں عدل و انصاف کے ساتھ توازن قائم رکھو۔ اور کسی کے حقوق و فرائض میں کسی قسم کی کمی بیشی نہ کرو۔

انسانی معاشرہ میں عدل و انصاف قائم رکھنے کے لئے جو نظام قائم کیا جائے گا اس میں احکامِ خداوندی کے ساتھ میزان کو بھی منزل من اللہ بتایا گیا ہے۔ (۵۷/۲۵، ۴۲/۱۷)۔ اور قیامت میں اعمالِ انسان کے "تولنے" کے لئے بھی میزان کھڑی کی جائے گی۔ (۲۱/۴۷) اس میزان کا مقصد یہ بتایا گیا ہے کہ: فَلَا تُظْلَمُ نَفْسٌ شَيْئًا (۲۱/۴۷) "تاکہ کسی شخص پر کسی قسم کی زیادتی نہ ہو" یہ ہے میزان

کا بنیادی مقصد۔

میزان کے اس بنیادی مقصد کو سامنے رکھ کر، آپ کاروباری دنیا کی طرف آئیے۔ اس میں عام حکم تو یہ دیا گیا ہے کہ: اَوْفُوا الْكَيْلَ وَالْمِيْزَانَ بِالْقِسْطِ (6/152؛ 17/35)۔ خرید و فروخت کی دنیا میں تو اس حکم سے عام مراد یہی ہوگی کہ ماپ اور تول کے پیمانے صحیح رکھو۔ لیکن بنظرِ تعمق دیکھنے سے یہ حقیقت واضح ہو جائے گی کہ اس سے مراد یہ بھی ہے کہ جو کچھ کسی سے لو، یہ دیکھو کہ اسے اس کی قیمت کے مطابق چیز ملتی ہے؟ ظاہر ہے کہ ماپ اور تول صحیح رکھنا تو ہر دکاندار کا انفرادی عمل ہوگا لیکن یہ فیصلہ کرنا کہ گاہک کو اس کی ادا کردہ رقم کے مطابق چیز مل رہی ہے یا نہیں، کسی نظام کے تابع ہوگا۔ یعنی اشیاءِ صرف کی قیمتیں مقرر کرنا اس نظام کا فریضہ ہوگا۔ اسی میں یہ بات بھی شامل ہوگی کہ خریدار کو آمیزش کے بغیر مطلوبہ چیز ملے۔ یہ نہ ہو کہ قیمت تو دودھ کی ادا کرے اور ملے اسے "دودھیا پانی" (MILKY WATER) یا کپڑے کے ہر گز پر لکھا ہوا تو ہو (PURE WOOL) اور ہو اس میں (NYLON) کا مکسچر۔ اس قسم کی تجارت بھی حرام ہوگی۔ قرآن کریم نے بتایا ہے کہ جس قوم کے کاروبار میں اس قسم کی خرابیاں پیدا ہو جائیں، وہ بہت جلد تباہ ہو جاتی ہیں۔ اسی کی شہادت میں اس نے قومِ شعیبؑ کی عبرت آموز داستان بیان کی ہے۔ حضرت شعیبؑ ان سے بار بار کہتے تھے کہ: فَاَوْفُوا الْكَيْلَ وَالْمِيْزَانَ وَلَا تَبْخَسُوا النَّاسَ اَشْيَآءَهُمْ وَلَا تُفْسِدُوْا فِى الْاَرْضِ بَعْدَ اِصْلَاحِهَا (7/85)۔ "تم ماپ اور تول کے پیمانے صحیح رکھو، اور جو کچھ کسی سے لو اس کے مطابق اسے چیز دو۔ اس میں کسی قسم کی کمی نہ کرو۔ ایسا کرنا ملک میں فساد برپا کرنے کے مرادف ہوگا۔ جس کا نتیجہ تباہی کے سوا کچھ نہیں ہو سکتا۔ (نیز 11/84-85؛ 26/181) اس سے واضح ہے کہ خرید و فروخت کے غلط نظام کا نتیجہ پوری کی پوری قوم کی تباہی ہوتا ہے۔

محنت کا معاوضہ

قرآن کریم کی رُو سے سب سے اہم سوال محنت کش کی محنت کے معاوضہ کا ہے۔ اگر اس کو محنت کا پورا پورا معاوضہ نہ دیا جائے تو جو کچھ اس میں سے غصب کر لیا جائے، وہ حلال نہیں ہوگا، حرام ہو جائے گا۔ اس نے صاحبِ ضربِ کلیم حضرت موسیٰؑ اور فرعون کی آویزش کے سلسلہ میں کہا ہے کہ فرعون دوسروں کی محنت کو غصب کر لیتا تھا۔ اس لئے حضرت موسیٰؑ سے کہا گیا کہ اس کے مستبد اور ظالم نظام کو الٹ کر اس کی جگہ نظامِ خداوندی قائم کریں۔ لِتُجْزٰى كُلُّ نَفْسٍۢ بِمَا تَسْعٰى۔ (20/15) "تا کہ ہر ایک کو اس کی محنت کا پورا پورا معاوضہ مل سکے"۔ فَلَا يَخٰفُ ظُلْمًا وَّلَا هَضْمًا (20/112) اور کسی کو اس کا خطرہ نہ رہے کہ اس کے ساتھ ظلم و زیادتی ہوگی۔ اور اس کی محنت کے معاوضہ کو ہضم کر لیا جائے گا۔

نظامِ سرمایہ داری میں یہ ناممکن ہے کہ محنت کش (مستاجر) کو اس کی محنت کا پورا پورا معاوضہ دیا جا سکے۔ اس میں محنت کشوں کو اجرت (WAGES) پر ملازم رکھا جاتا ہے، مستاجر (مزدور) اپنی اجرت مقرر نہیں کرتا۔ اسے آجر (ملازم رکھنے والا) مقرر کرتا ہے۔ اس معاملہ کو یہ کہہ کر برحق قرار دے دیا جاتا ہے کہ مزدور اپنی رضامندی سے اجرت منظور کرتا ہے، اس لئے اس پر کوئی ظلم اور زیادتی نہیں ہوتی۔ لیکن یہ وہی دلیل ہے جسے ہم تجارت کے باب میں دیکھ چکے ہیں کہ "خریدار اپنی رضامندی سے قیمت ادا کرتا ہے"۔ واقعہ یہ ہے کہ خریدار ہو یا مزدور، دونوں اپنی مجبوری کی وجہ سے دوسرے کی بات مان لیتے ہیں۔ جس مزدور کے گھر میں کھانے کو ہو وہ کبھی آجر کی نامناسب شرائط پر کام کرنے کے لئے تیار نہیں ہوگا۔ اس کی معاشی مجبوریاں ہوتی ہیں جو وہ ہر شرط پر کام کرنے کو تیار ہو جاتا ہے۔ پنجابی زبان کا ایک محاورہ ہے کہ "بھاکِن وگاڑیا ——— رات دیاں بھکیاں"۔ "رات کو بھوکے سونے والے نرخ بگاڑ دیتے ہیں"۔ قرآن کے معاشی نظام میں اجرتوں کا سوال ہی نہیں ہوتا۔ مملکت تمام افرادِ معاشرہ کی ضروریاتِ زندگی پورا کرنے کی ذمہ داری اپنے اوپر لیتی ہے لیکن یہ اس وقت کی بات ہے جب (اور جہاں قرآنی نظام رائج ہو)۔ سوال یہ ہے کہ موجودہ حالات میں کیا کیا جائے۔ اس کا جواب یہی ہے کہ مملکت ایسا طریق وضع کرے جس سے محنت کش کی محنت غصب نہ کی جا سکے۔ ہم تو آجر سے اتنا ہی کہہ سکتے ہیں کہ مستاجر (مزدور) کی محنت سے جو کچھ غصب کیا جائے وہ رزقِ حلال نہیں رہتا۔

کام چور

قرآن کریم جہاں آجر کو اس کی تاکید کرتا ہے کہ وہ مستاجر کی محنت کو غصب نہ کرے، وہاں وہ مستاجر (مزدور) سے بھی کہتا ہے کہ وہ اپنی محنت کا معاوضہ لینے کا حقدار ہے۔ اگر محنت کئے بغیر معاوضہ کا مطالبہ کرتا ہے تو وہ کمائی بھی حلال نہیں ہوگی۔ لَیْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَا سَعٰی ﴿٥٣/٣٩﴾ اس کا بنیادی اصول ہے۔ یعنی انسان صرف اپنی محنت کے معاوضہ کا حقدار ہے۔ "کام چور" کی کمائی، حلال کی کمائی نہیں کہلا سکتی۔

جو کچھ اوپر آجر اور مستاجر کے متعلق کہا گیا ہے اس کا اطلاق ملازمت پیشہ حضرات پر بھی یکساں ہوتا ہے، وہ بھی اُجرت ہی پر کام کرتے ہیں جسے تنخواہ کہا جاتا ہے۔

تطفیف

بات چلی تھی ماپ تول کے پیمانوں سے۔ اس ضمن میں آجر اور مستاجر کے معاملہ کا ذکر آگیا۔ قرآن کریم میں ایک سورۃ ہے جس کا عنوان ہے۔ المطففین۔ تطفیف کے لغوی معنی ہیں پیالہ کو پورا پورا نہ بھرنا۔

اس میں کچھ کمی کر دینا۔ نیز اس کے معنی ہوتے ہیں: "اونٹنی کے پاؤں اس طرح باندھ دینا کہ وہ پوری رفتار سے نہ چل سکے"۔ ایسا کرنے والے کون لوگ ہوتے ہیں اور ان کا انجام کیا ہوتا ہے اسے قرآن کریم نے خود ہی واضح کر دیا۔ فرمایا۔ وَيْلٌ لِّلْمُطَفِّفِينَ ۝ "تطفیف کی ذہنیت اور روش اختیار کرنے والے تباہ ہو جاتے ہیں۔ اَلَّذِيْنَ اِذَا اكْتَالُوْا عَلَى النَّاسِ يَسْتَوْفُوْنَ ۝ "یہ وہ ہیں کہ جب دوسروں سے اپنے واجبات وغیرہ لیتے ہیں تو پورے پورے لیتے ہیں۔ ذرا نہیں چھوڑتے"۔ وَاِذَا كَالُوْهُمْ اَوْ وَّزَنُوْهُمْ يُخْسِرُوْنَ ۝ (83/1-3) "لیکن جب دوسروں کے واجبات اور حقوق دیتے ہیں تو ڈنڈی مار جاتے ہیں"۔ اس آیت میں کالوھم اور وزنوھم کے یہ معنی بھی ہو سکتے ہیں کہ دوسروں کو دیتے وقت ماپ اور تول میں کمی کر دیتے ہیں، اور یہ معنی بھی چیزوں ہی کو نہیں۔ جب یہ خود انسانوں کو ماپتے اور تولتے ہیں تو ان کی استعداد اور صلاحیت کے مطابق صلہ نہیں دیتے۔ کوشش کرتے ہیں کہ انہیں کم از کم دیا جائے اور ایسے حالات پیدا کئے جائیں کہ وہ اپنی صلاحیتوں کی نمود کر سکیں۔ وہ ان کے "پاؤں باندھ کر" رکھتے ہیں۔ یہ بھی دوسروں کی محنت اور صلاحیتوں کے استحصال (EXPLOITATION) کا ایک طریق ہے جو آج کل کے صنعتی دور کی عام روش ہے۔ اس طریق سے حاصل کردہ دولت بھی رزقِ حرام کے زمرہ میں شامل ہوگی۔

خیانت

یہاں تک گفتگو ان معاملات کے بارے میں تھی جن میں دو فریق شامل ہوتے ہیں۔ لیکن قرآن کریم نے ان معاملات کا بھی ذکر کیا ہے جن میں ایک ہی شخص ملوث ہوتا ہے۔ اس کا حکم ہے کہ: (لَا) تَخُوْنُوْٓا اَمٰنٰتِكُمْ (8/27) "جو امانتیں تمہارے سپرد کی جائیں ان میں خیانت مت کرو"۔ امانت صرف وہی نہیں جیسے ایک شخص کسی دوسرے شخص کے پاس بغرضِ حفاظت رکھ دے، اس میں وہ تمام روپیہ یا مال اسباب وغیرہ شامل ہے جو حکومت، یا کوئی ادارہ یا فرم اپنے کسی ذمہ دار افسر کو کسی پراجیکٹ کی تکمیل کے لئے دیتی ہے، یا جو روپیہ پیسہ ویسے ہی اس کی تحویل میں رہتا ہے۔ جیسے خزانچی یا بینک کے افسر۔ اس روپیہ میں کسی قسم کی بددیانتی، خیانت ہے اور بدترین جرم۔ اس قسم کی کمائی یکسر حرام ہے۔

حلال و طیّب

رزق حلال و حرام کے سلسلہ میں قرآن کریم بہت دور تک جاتا ہے۔ اس نے متعدد مقامات پر کہا ہے کہ: وَكُلُوْا مِمَّا رَزَقَكُمُ اللّٰهُ حَلٰلًا طَيِّبًا ۖ وَّاتَّقُوا اللّٰهَ الَّذِيْٓ اَنْتُمْ بِهٖ مُؤْمِنُوْنَ ۝

"جو حلال رزق اللہ نے تمہیں دیا ہے کہ اسے طیّب طریق سے کھاؤ اور اس طرح اس خدا کے حکم کی نگہداشت کرو جس پر تم ایمان لانے کے مدعی ہو۔" "رزق حلال کو طیّب طور پر کھاؤ" یہ نکتہ غور طلب ہے۔ اسے ایک مثال کی رُو سے سمجھئے۔ بکرا حلال جانور ہے، لیکن اگر اسے خدا کا نام لے کر ذبح نہ کیا جائے تو اس کا گوشت حلال نہیں رہتا حرام ہو جاتا ہے۔ یہاں تک تو سب متفق ہیں اور ہم اس کی بڑی احتیاط برتتے ہیں۔ لیکن سوال یہ ہے کہ اگر کسی کا بکرا چرا کر اسے صحیح طریق سے ذبح کر لیا جائے تو کیا وہ حلال رہے گا؟ قرآن کریم کا فیصلہ ہے کہ وہ حلال نہیں رہے گا۔ کیونکہ ناجائز طریق سے حاصل کئے جانے کی وجہ سے وہ طیّب نہیں رہا۔ لہٰذا جو چیزیں اپنی اصل کے اعتبار سے حلال ہیں اگر انہیں ناجائز طریق سے حاصل کیا جائے تو وہ طیّب نہیں رہتیں' اس لئے حرام ہو جاتی ہیں۔ حلال کے لئے طیّب ہونا شرط ہے۔ سورۂ مائدہ میں ہے یَسْئَلُوْنَكَ مَاذَآ اُحِلَّ لَهُمْ ۭ قُلْ اُحِلَّ لَكُمُ الطَّيِّبٰتُ ۙ (5/4) اے رسولؐ! یہ لوگ تجھ سے پوچھتے ہیں کہ اللہ نے ان کے لئے کیا کچھ حلال قرار دیا ہے، ان سے کہو کہ اس نے طیّبات کو حلال قرار دیا ہے، ان سے کہو کہ اس نے طیّبات کو حلال قرار دیا ہے۔ یعنی ان حلال چیزوں کو جو ناجائز طریق سے حاصل کی گئی ہوں۔

"حلال اور طیّب" کی جامعیت کے طور پر قرآن مجید میں ہے۔ يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ كُلُوْا مِمَّا فِي الْاَرْضِ حَلٰلًا طَيِّبًا ڮ وَّلَا تَتَّبِعُوْا خُطُوٰتِ الشَّيْطٰنِ ۭ اِنَّهٗ لَكُمْ عَدُوٌّ مُّبِيْنٌ (2/168) "اے لوگو! زمین میں جو کچھ حلال ہے اسے طیّب طریق سے کھاؤ۔ اسے غیر طیّب طریق سے کھانے سے تم شیطان کے نقشِ قدم کی پیروی کرو گے۔ یاد رکھو! شیطان تمہارا کھلا ہوا دشمن ہے۔" اس کے معنی یہ ہیں کہ ناجائز طریق سے حاصل کردہ دولت سے جو کچھ بھی تم خریدو گے، وہ اگر اپنی اصل کے اعتبار سے حلال بھی ہو تو بھی حرام ہو جائے گا۔ حلال وہی چیزیں ہوں گی جنہیں حلال کی کمائی سے حاصل کیا جائے۔ اسی کو قرآنِ مجید نے رزقِ کریم (8/4 ، 22/50) کہا ہے۔ یعنی "عزت کی روٹی" اس کی

عزت کی روٹی

وضاحت کرتے ہوئے دوسری جگہ کہا کہ خبیث (ناجائز کمائی سے حاصل کردہ) چیزیں کھانے والے خود خبیث ہوتے ہیں اور طیّب چیزیں کھانے والے طیّب۔ لَهُمْ مَّغْفِرَةٌ وَّرِزْقٌ كَرِيْمٌ (22/50)۔ یہی (طیّب لوگ) ہیں جو تباہی سے محفوظ رہتے ہیں، اور جنہیں عزت کی روٹی ملتی ہے۔

تکاثر

ان تصریحات کے بعد قرآنِ کریم کہتا ہے کہ لوگ ناجائز طریقے اسی لئے اختیار کرتے ہیں کہ وہ چاہتے ہیں کہ وہ دولت سمیٹنے کی دوڑ (RACE) میں ایک دوسرے سے آگے نکل جائیں۔ اسے

عربی زبان میں "تکاثر" کہتے ہیں جو قرآن کریم کی ایک سورۃ کا عنوان ہے۔ اس میں کہا گیا ہے کہ، اَلْهٰكُمُ التَّكَاثُرُ حَتّٰى زُرْتُمُ الْمَقَابِرَ (۱۰۲/۱-۲) دولت سمیٹنے کی دوڑ میں ایک دوسرے سے آگے نکل جانے کی ہوس انسان کو زندگی کے صحیح مقاصد کی طرف سے غافل کر دیتی ہے۔ اور یہ دوڑ کہیں ختم نہیں ہوتی۔ یہ قبر تک چلی جاتی ہے۔ ضروریات کی ایک حد ہوتی ہے لیکن جب جذبہ محض دولت سمیٹنا ہو اور اس میں ایک دوسرے سے آگے نکل جانے کی ہوس، تو اس کی کوئی انتہا نہیں ہوتی۔ وہ انسان کو پاگل کر دیتی ہے۔ یہ وہ پاگل پن ہے جس میں جائز اور ناجائز کی تمیز باقی نہیں رہتی۔ ایسے لوگوں کا مقصدِ حیات جَمَعَ مَالًا وَّعَدَّدَهٗ (۱۰۴/۲) رہ جاتا ہے۔ یعنی "دولت جمع کرتے چلے جانا اور پھر اُسے گنتے رہنا" بس یہ ہوتی ہے ان کی زندگی! يَحْسَبُ اَنَّ مَالَهٗ اَخْلَدَهٗ (۱۰۴/۳) ایسا انسان اس خیالِ خام میں مبتلا ہوتا ہے کہ اس کا مال اسے حیاتِ جاوید عطا کر دے گا۔ كَلَّا۔ یہ بالکل غلط ہے۔ یہ مال و دولت اُسے جہنم رسید کر کے ریزہ ریزہ کر دے گا۔ (۱۰۴/۴-۹) ناجائز کمائی سے جمع کردہ مال و دولت انسان کو تباہی سے نہیں بچا سکتا۔ وَمَا يُغْنِيْ عَنْهُ مَالُهٗٓ اِذَا تَرَدّٰى (۹۲/۱۱) جب تباہی اس کے سامنے آئیگی تو وہ سمجھے گا کہ میں اپنی دولت کو بڑی قوت کا باعث سمجھتا تھا لیکن هَلَكَ عَنِّيْ سُلْطٰنِيَهْ (۶۹/۲۹) قوت کا یہی زعمِ باطل مجھے لے ڈوبا اور کوئی یار و مددگار میرے کام نہ آیا (۶۹/۳۵)

انسان اکثر و بیشتر اولاد کی خاطر کمائی کے ناجائز طریقے اختیار کرتا ہے۔ اس ضمن میں قرآنِ کریم نے کہا ہے کہ، وَاعْلَمُوْٓا اَنَّمَآ اَمْوَالُكُمْ وَاَوْلَادُكُمْ فِتْنَةٌ (۸/۲۸) یاد رکھو! اس طرح حاصل کردہ مال اور تمہاری اولاد تمہارے لئے فتنہ بن جاتے ہیں۔ اس سے بچو۔

حلال اور حرام کمائی کے ضمن میں جو کچھ اوپر کہا گیا ہے اس کا ماحصل یہ ہے کہ رزق حلال وہ ہے جو ان طریقوں سے حاصل کیا جائے جنہیں قرآن کریم جائز قرار دیتا ہے۔ اسے وہ حق کہہ کر پکارتا ہے۔ اور رزقِ حرام وہ ہے جو ناجائز طریقوں سے حاصل کیا جائے۔ اسے وہ باطل کہتا ہے۔ حق و باطل (حرام اور حلال) کے متعلق اس کا فیصلہ یہ ہے کہ،

وَيَمْحُ اللّٰهُ الْبَاطِلَ وَيُحِقُّ الْحَقَّ بِكَلِمٰتِهٖ اِنَّهٗ عَلِيْمٌ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ (۴۲/۲۴)

خدا کا قانونِ مکافات یہ ہے کہ حق باقی رہتا ہے اور باطل مٹ جاتا ہے۔ باطل کے جواز میں تم کتنے ہی عذر پیش کرو، وہ قابلِ قبول نہیں ہو سکتے۔ کیونکہ خدا تمہارے دل میں چھپے ہوئے خیالات تک سے واقف ہوتا ہے۔

لہٰذا، خدا پر ایمان رکھنے والے، ناجائز کمائی کا خیال تک بھی دل میں نہیں لا سکتے۔ ہمارے ہاں اس قسم کی بحثیں تو عام ہوتی ہیں کہ کوا حلال ہے یا حرام۔ اے کاش! اس قسم کی بحثوں میں الجھنے والے، مسلمانوں کو یہ بھی بتاتے کہ ناجائز کمائی سے حلال بھی حرام ہو جاتا ہے۔ اسی طرح کا حرام جس طرح سور

کا گوشت حرام ہے جس دن یہ حقیقت ہمارا جزوِ ایمان بن گئی، معاشرہ سے (CORRUPTION) اور اس سے پیدا ہونے والی خرابیوں کا خاتمہ ہو جائے گا۔ اس کے سوا اصلاحِ معاشرہ کی کوئی صورت نہیں۔

ایک کہانی

رزقِ حلال سے، معاشرہ کی خرابیوں ہی کا استیصال نہیں ہوتا۔ اس سے افراد کے کیریکٹر میں اس قدر پختگی اور بلندی پیدا ہو جاتی ہے جس کا ہم اندازہ بھی نہیں کر سکتے۔ اس ضمن میں ہمیں بچپن میں ایک کہانی پڑھائی جایا کرتی تھی جو بڑی پُر معنی تھی۔ محمود غزنوی جب ہندوستان پر حملہ کے لئے آیا تو اس کی فوج میں ایک بیوہ کا نوجوان بیٹا بھی سپاہی تھا۔ جب اس کی فوج فاتح و منصور واپس گئی تو وہ بڑھیا اپنے بیٹے کی تلاش میں لشکر میں آئی۔ اس کے بیٹے کے ساتھیوں نے اس سے کہا کہ تمہارا بیٹا تو میدانِ جنگ میں مارا گیا تھا۔ اس نے پوچھا کہ اس کی موت کس طرح واقعہ ہوئی تھی؟ انہوں نے کہا کہ وہ میدانِ جنگ سے بھاگ اٹھا۔ دشمن کا تیر اس کی پشت پر لگا اور وہ مر گیا۔ اس بڑھیا نے کہا کہ یہ تو درست ہو سکتا ہے کہ وہ میدانِ جنگ میں شہید ہو گیا ہو لیکن اسے میں کسی صورت میں ماننے کے لئے تیار نہیں ہو سکتی کہ وہ میدانِ جنگ سے بھاگ اٹھا تھا اور اس کی پشت میں تیر لگا تھا۔ یہ کبھی نہیں ہو سکتا۔ اس نے دشمن کے سامنے کھڑے ہو کر اپنے سینے پر تیر کھایا ہوگا۔ انہوں نے کہا کہ مائی! تم تو میدانِ جنگ میں تھی نہیں۔ تم یہ بات اس حتم و یقین کے ساتھ کیسے کہہ سکتی ہو؟ اس نے کہا کہ اس لئے کہ میں نے اس کے حلق میں حرام کے دودھ کا ایک قطرہ بھی ٹپکنے نہیں دیا تھا۔ جس بچے کی پرورش رزقِ حلال پر ہوئی ہو، ناممکن ہے کہ وہ میدانِ جنگ میں پیٹھ دکھا کر بھاگ نکلے۔

بات بڑھتے بڑھتے سلطان تک جا پہنچی۔ اس نے تحقیق کرائی تو بڑھیا کی بات سچ نکلی۔ اس سپاہی نے اپنے سینے پر تیر کھا کر جان دی تھی۔ اس کے ساتھیوں نے یہ غلط بیانی ہنسی مذاق کے طور کی تھی۔

یہ کہانی تاریخی اعتبار سے کیسی ہی ہو، حقیقت کے اعتبار سے بالکل سچی ہے۔ رزقِ حلال سے انسان کے اندر، حق گوئی و بے باکی اور جرأت و بسالت کی وہ قوتیں بیدار ہو جاتی ہیں جن کا ہم اندازہ نہیں لگا سکتے۔ اور جو قوم اس قسم کے افراد پر مشتمل ہوگی اسے دنیا میں کون شکست دے سکتا ہے؟

اسی حقیقت کے پیشِ نظر تو علامہ اقبال نے کہا تھا کہ: ؎

اے طائرِ لاہوتی! اس رزق سے موت اچھی
جس رزق سے آتی ہو، پرواز میں کوتاہی!

حرام کی کمائی سے افراد اور قوم میں بلندیوں کی طرف جانے کی صلاحیتیں ہی سلب ہو جاتی ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ جس فرد یا قوم کو حرام کی کمائی کا چسکا پڑ جائے، وہ محنت کرنے سے جی چراتی ہے اور جب یہ عادت (یعنی محنت کے بغیر مال و دولت حاصل کرنے کی روش) پختہ ہو جائے تو محنت کرنے کی صلاحیت ہی سلب ہو جاتی ہے۔ قرآنِ کریم نے باطل (ناجائز) کمائی کو اثم سمجھ کر پکارا ہے۔ ($\frac{2}{188}$) اثم کے معنی ہیں ایسی روش جس سے قوائے عملیہ میں اضمحلال واقع ہو جائے اور انسان اپنے ساتھیوں سے بچھڑ کر پیچھے رہ جائے۔ اسی طرح قرآنِ کریم نے مَیْسِرَہ کو بھی ناجائز قرار دیا ہے۔ ($\frac{2}{219}$)۔ ہمارے ہاں میسرہ کا عام ترجمہ جوا کیا جاتا ہے۔ یہ ٹھیک ہے۔ جوا بھی میسرہ میں شامل ہے لیکن اس لفظ کا اطلاق صرف جوا پر نہیں ہوتا۔ اس لفظ کا مادہ یسر ہے اور یسار کے معنی بایاں ہاتھ ہیں جس طرح ہم اپنے ہاں ہر آسان کام کے متعلق کہتے ہیں کہ یہ میرے بائیں ہاتھ کا کھیل ہے۔ اسی طرح ہر وہ کمائی جو محنت اور مشقت کے بغیر (ناجائز طریق سے) بآسانی حاصل ہو جائے وہ میسرہ میں شامل ہو گی۔ ایسی کمائی کے متعلق بھی یہی کہا گیا ہے کہ:
فِيهِمَا إِثْمٌ كَبِيرٌ وَمَنَافِعُ لِلنَّاسِ ($\frac{2}{219}$) اس سے دولت تو ضرور اکٹھی ہو جاتی ہے لیکن انسان کے قوائے عملیہ میں اضمحلال واقع ہو جاتا ہے اور إِثْمُهُمَا أَكْبَرُ مِن نَّفْعِهِمَا ($\frac{2}{219}$) اور قوائے عملیہ میں اضمحلال واقع ہو جانے سے جو نقصان ہوتا ہے وہ اس فائدہ سے کہیں زیادہ ہوتا ہے جو اس طرح دولت حاصل ہونے سے ہوتا ہے۔

یہ ہے وجہ جو ناجائز کمائی سے قومیں تباہ ہو جاتی ہیں۔ اس سے "پرواز میں کوتاہی" واقع ہو جاتی ہے۔ اور جس رزق سے پرواز میں کوتاہی آ جاتی ہو اس سے (علامہ اقبالؒ کے الفاظ میں موت ہزار درجہ بہتر ہوتی ہے۔ چوری، فریب دہی، گراں فروشی، ذخیرہ اندوزی، جیب تراشی، رشوت ستانی، خیانت، بد دیانتی یا شباشب کروڑ پتی بن جانے کی ہوس۔ یہ سب اثم اور میسرہ (محنت سے جی چرانے) کے شجرِ خبیثہ کے برگ و بار ہیں اور ان کا علاج رزقِ حلال

گر جہاں داند حرامش را حرام
تا قیامت پختہ ماند ایں نظام!

(اقبالؒ)

جو قوم، قرآن کریم کے حرام قرار دادہ رزق کو حرام سمجھ لے اس کا نظامِ حیات قیامت تک محکم اور استوار رہے گا۔

باباجی کے بعد!

یہ سچ ہے اور ہم اس حقیقت کا سامنا کرنے پر مجبور ہیں کہ ہمارے باباجی اب ہمارے درمیان نہیں رہے اور ہم ان کی اس بے مثال رفاقت سے محروم ہو گئے ہیں جس نے ہم سب سامعین درسِ قرآن کے دامن گوہر ہائے قرآنی سے بھر بھر دیئے۔ بلا شک و شبہ ایسا فہم شناسِ قرآن رجلِ رشید جو قرآن حکیم کو اِنَّ عَلَيْنَا بَيَانَهٗ کی روشنی میں سمجھتا اور سمجھاتا رہا کبھی صدیوں میں پیدا ہوتا ہے۔ ہم وہ سب جو جناب پرویزؒ کی فکرِ قرآنی اور بصیرتِ قرآنی سے اپنی فکر کی تطہیر کے لئے روشنی حاصل کرتے رہے۔ ان کی دائمی مفارقت پر جتنا بھی غم کریں کم ہے کہ ہمیں اب ایسا دانائے راز معلّمِ شفیق میسّر نہیں آئے گا اور یہ خلا اب خلا ہی رہے گا، مگر ہم یہ بھی جانتے ہیں کہ رنج و غم کا تعلق ہمارے جذبات سے ہوتا ہے اور ہمیں باباجی نے صداقت و استقامت کا یہ روشن راستہ دکھا چکے ہیں کہ جذبات کو ہمیشہ عقل کے تابع رکھنا چاہیئے ورنہ وہ انسان کو بے قابو کر دیتے ہیں۔ باباجی ایسی شفیق اور نابغۂ روزگار ہستی کے بچھڑنے کا ملال اپنی جگہ اور لاریب، ان کی یاد کبھی بھلائی نہیں جا سکتی لیکن اس عظیم یاد کا حق بھی تو ہمیں ادا کرنا ہے۔ ان کے بعد خصوصاً ہم سامعین درسِ قرآن پر جو اہم ذمہ داری عائد ہوتی ہے اس کو پورا کرنے سے ہی ہم اس یاد کو قائم رکھ سکتے ہیں۔ باباجی تو قانونِ قدرت کے مطابق اس حیاتِ ارضی کو چھوڑ چکے ہم سے ان کا بچھڑنا بلاشبہ ہماری بڑی بدقسمتی ہے۔ لیکن شاید ہماری نظر اس طرف نہیں جاتی کہ اس منفکرِ قرآن کے حسنِ تفکر کا فیضان تو اس کے بعد بھی اس کی اپنی محفوظ آواز میں جاری و ساری ہے۔ اور ہم لاہور کے رہنے والے اب بھی ہر جمعے کی صبح کو اسی ۲۵۔ بی گلبرگ میں ٹی وی کی بڑی سکرین پر اپنے باباجی کو اسی طرح اپنے مخصوص انداز میں شگفتہ بیانی کے ساتھ حقائقِ قرآنی کی ترجمانی کرتے ہوئے دیکھ سکتے ہیں۔ اور پہلے کی طرح درسِ قرآن سے فیضیاب ہو سکتے ہیں۔ اس صورت میں اس سلسلے کا برقرار رہنا کیا ہم اسے اپنی انتہائی خوش بختی سے تعبیر نہ کریں گے؟ اس عاشقِ قرآن کا وجود ہماری نظروں سے اوجھل ہونے کے باوجود ہمیں اس کی رہنمائی کا ملتے رہنا ہمارے حق میں وہ رحمتِ خداوندی ہے جس کا بدل ہو نہیں سکتا۔ اس پر بھی ہم اگر تساہل پسندی سے کام لیتے ہوئے اس سے پہلوتہی کریں یا اس احساسِ غم کے بوجھ تلے، کہ باباجی نہیں رہے اس راہِ قرآنی سے غافل ہو جائیں تو کیا یہ اس

تعلیم و تربیّت کی تکذیب کرنا نہ ہوگا جو ہم پچیس سال تک بابا جی کے درسِ قرآنی سے حاصل کرتے رہے ہیں؟ اور روزِ روشن کی طرح عیاں اس حقیقت کو ہم میں سے ہر فرد اچھی طرح جانتا ہے کہ جب تک پرویز صاحب زندہ رہے انہوں نے اپنی زندگی کا لمحہ لمحہ قرآن کریم میں تفکّر و تدبّر کرنے کے لئے وقف رکھا۔ پچاس برس تک قرآن عزیز کے ایک طالبعلم کی حیثیت سے وہ اس کے ساتھ متمسک رہے۔ اس کے پیغام کو اس طرح سمجھا اور سمجھایا کہ باطل تصوّرات کی تمام تاریکیاں چھٹ گئیں۔ اس سرچشمۂ دین کی حقیقی تعلیم کو امّت تک پہنچانے کے لئے انہوں نے قلم اور کاغذ کو اپنا رفیقِ کار بنا کر دن رات انتہائی محنت کی۔ جس کے نتیجے میں ان کی لکھی ہوئی بیش بہا نادر اور منفرد تصنیفات کی صورت میں وہ فکر انگیز بصیرت افروز، باطل شکن اور حیات آفریں حقائق منظرِ عام پر آئے کہ جن سے دلوں کی دنیا میں انقلاب برپا ہوگیا۔ سوچ بچار اور حقیقت شناسی کی نئی اور مستحکم راہیں کھل گئیں۔ بابا جی نے اپنے اس عظیم الشّان کام کو تاحیات جاری رکھا اور خالصتًا قرآنی تعلیم کو عام کرنے کی جدوجہد سے کسی ساعت منہ نہیں موڑا۔ ان کی کتابیں ان کے خطابات و مقالات اور ماہنامہ طلوعِ اسلام کے ہزارہا صفحات ان کی سچی لگن، ان کی تحقیق و جستجو اور ان کے اس عزمِ صمیم کی شہادت دیتے ہیں جو اس سلسلے میں ان کے ہمرکاب رہے۔ دیگر بیسیوں حقیقت کُشا کتب کے علاوہ بابا جی کی ان انمول کتابوں کو نہ جاننے والے بدنصیب ہی ہوں گے جو سلسلۂ معارف القرآن خصوصًا، معراجِ انسانیت یعنی سیرت صاحبِ قرآن (علیہ التحیۃ والسلام) خود قرآن کے آئینہ میں، لغات القرآن (چار جلدوں میں) مفہوم القرآن (قرآن کے تیس پاروں کا احاطہ کئے ہوئے)، تبویب القرآن (تین جلدوں پر مشتمل جن میں پورے قرآن کی باب بندی کی گئی ہے) اور مطالب الفرقان پر مشتمل ہیں (پانچ جلدوں کے ساتھ یہ سلسلہ جاری ہے)۔ اس مردِ دانا و بینا کا اپنی ان تصانیف کے متعلق نکتۂ نظر یہ تھا کہ یہ تدبّر فی القرآن (جو حکم خداوندی ہے) کے راستے میں آسانیاں پیدا کرنے کے ذرائع ہیں۔ کیا اس صداقت سے انکار کیا جا سکتا ہے؟ ہم جو ان خزینوں سے متمتع ہوتے رہے ہیں کیا ہم پہ قرآن سہل نہیں ہوا؟ کیا ہمارے قلب و ذہن کو جلا نہیں ملی؟ یقینًا ہم خود ساختہ مفروضات باطل تصورات اور گمراہ کن عقائد کے اندھیروں سے نکل کر حق کی اس روشنی میں آگئے جسے کوئی مٹا نہیں سکتا۔ ہمیں اس کے علاوہ جو بڑی نعمت میسّر رہی وہ بابا جی کا درسِ قرآن تھا۔ جس نے پچیس برس تک ہم اہالیانِ لاہور کے لئے تابناک مشعل جلائے رکھی۔ ان درسوں میں کبھی کسی ناگزیر سبب سے ناغہ پڑا ہو تو پڑا ہو۔ ورنہ ہمیں معلوم ہے کہ بابا جی نے پہلے ہر اتوار اور پھر جمعے کے جمعے ہمیں کبھی ان سے محروم نہیں رکھا۔ یہ ہم سامعینِ درسِ قرآن ہی جانتے ہیں کہ پیرانہ سالی تک پہنچ جانے کے باوجود ہمارے معلمِ مشفق نے نہایت جواں ہمتی اور شگفتہ مزاجی سے درس دیئے۔ موضوع میں ڈوب کر درس دیتے۔ اس سلاست و روانی کے ساتھ کہ سننے والوں کی کوئی الجھن باقی نہ رہی۔ یوں ہم اس معلّمِ قرآن کے فہم و ادراکِ قرآنی کے موتیوں سے اپنی جھولیاں بھرتے رہے اور مطمئن رہے یہ سوچ کر کہ ہمارے بابا جی نے اپنی صحت و آرام کا کوئی خیال کئے بغیر

اس قدر جانفشانی سے اتنا بڑا کام سنبھالا ہوا ہے تو یہ یونہی چلتا رہے گا۔ مگر اس قرآنی مشن کو مسلسل آگے بڑھانے میں جو بہ وقتی ذمہ داری ہم سامعینِ درس کی تھی شاید اسے ہم نے نظر انداز کر دیا۔ کتنی بڑی بھول تھی ہماری! ہم نے دیکھا کہ باباجی کو قانونِ قدرت کے مطابق آخرت کا بلاوا آگیا اور ہم ان کو روک نہیں سکے۔ تو اب اس شفیق ہستی جو ہمارے باباجی تھے کے بعد ہمارے کرنے کا کام کیا ہے اور ہماری ذمہ داری میں کیا اور کتنا اضافہ ہوا ہے۔ باباجی کے بعد ان کے مشن کو ہم نے کس طرح جاری رکھنا ہے۔ ان کی جلائی ہوئی مشعل کو کس طرح روشن رکھنا ہے۔ یہ وہ سوال ہیں جن پر ہمیں غور کرنا ہے اور عملی طور پر ان کا جواب دینا ہے۔ علمی و عملی طور پر قرآنِ حکیم سے کلیتاً وابستہ رکھنے کے لئے ہمارے باباجی تو ایسی گرانقدر اور اتنی وافر رہنمائی اپنی لاثانی تحریروں کی شکل میں چھوڑی ہے کہ ہدایت حاصل کرنے والوں کے لئے کوئی کمی باقی نہیں رہ گئی۔ اب اس سے خود فیضیاب ہوتے رہنا اور دوسروں کو اس کی ترغیب دینا تو ہمارے اختیار و ارادے پر منحصر ہے۔ یاد رہے یہی اختیار و ارادہ اسلام کی پناہ میں بھی لے آتا ہے اور یہی کفر کی گرفت میں بھی لے جاتا ہے۔ تو کیا ہم خاص طور پر ہم سامعینِ درس اپنے اس فرض کو ادا نہ کریں گے۔ جیسا کہ میں نے پہلے بتایا ہے کہ اس بے بہا درس کا فیض تو بدستور جاری ہے اور باباجی کے بعد بھی ان کی دعوتِ حق بندگانِ حق کے لئے عام ہے۔ پھر ہم خود ہی اس سے محروم رہ کر بدنصیب کیوں بنیں! کیوں نہ ہم پہلے کی طرح ذوق و شوق سے اس میں شریک ہوں۔ اوروں کو شریک کریں اور صراطِ مستقیم کا یہ سلسلہ قائم رہے۔ اسی طرح ماہنامہ طلوعِ اسلام کی اشاعت کو بڑھانے اور اس کے خریداروں میں اضافہ کرنا ہماری ذمہ داری کا اہم حصہ ہے۔ یہ ماہنامہ طلوعِ اسلام کو شہروں شہروں پھیل جانا چاہیئے تاکہ ان کے ذریعے قرآنی مشن کو جاری رکھنے میں مدد مل سکے۔ اور آخر میں اپنی بہنوں یعنی باباجی کی طاہرہ بیٹیوں سے مخاطب ہونا بھی ضروری سمجھتی ہوں کہ ان کو درس لینے والی یہ بیٹیاں بہت عزیز تھیں اور ان کے انسانی و معاشرتی مسائل کی طرف وہ ہمیشہ خصوصی توجہ دیتے رہے۔ ہمیشہ ان کے غمگسار اور خیرخواہ رہے۔ میری ان بہنوں کو یاد رکھنا چاہیئے کہ باباجی کا سایۂ عاطفت ضرور ہم سے چھن گیا لیکن وہ ہمیں مردوں کے اس معاشرہ میں تہی دست اور بے بس نہیں چھوڑ گئے۔ جس حسن کارانہ انداز سے وہ ہماری قلبی و ذہنی تربیت کر گئے اور جیسا بھرپور اعتماد اپنی ذات پر کرنا وہ ہمیں سکھلا گئے ہیں۔ اس کے بعد ہمارے لئے کوئی محرومی کیسی؟ آئیے اور پہلے کی طرح باباجی کے درسِ قرآن میں شریک ہو کر قرآنی حقائق سے دلوں کو منور کیجئے۔

سبحان اللہ رب العظیم

راقمہ

ثریا اندلیب۔ ۱۴ر اپریل ۱۹۸۵ء

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ ط

فکرِ اقبالؒ کا سرچشمہ ـــــ قرآن

(پرویزؔ)

علامہ اقبالؒ کو ان کی زندگی ہی میں جس قدر شہرت اور مقبولیت حاصل ہوگئی تھی، شاید ہی کسی اور مفکر یا شاعر کو نصیب ہوئی ہو۔ لیکن اس کے باوجود انہوں نے (یوں کہیئے گویا اپنی زندگی کے آخری سانس میں) کہا کہ :-

چو رختِ خویش بربستم ازیں خاک　ہمہ گفتند باما آشنا بود
ولیکن کس ندانست ایں مسافر　چہ گفت و، باکہ گفت و، از کجا بود　(ارمغانِ حجاز۔ ص ۱۹۹)

اُس وقت تو اِسے عام طور پر شاعرانہ گلہ طرازی پر محمول کیا گیا لیکن جوں جوں وقت گزرتا گیا، اور گزرتا جارہا ہے، یہ بات سامنے آرہی ہے کہ جو کچھ انہوں نے کہا تھا، شاعری نہیں تھی۔ ایک حقیقت تھی جس کا انہوں نے بصد دردوسوز اظہار کیا تھا۔ ان کی وفات کے بعد، ان کی فکر اور شعر، ان کے کلام اور پیام کے متعلق ہزاروں مقالات لکھے گئے اور سینکڑوں کتابیں شائع ہوئیں ـــــ گذشتہ قریب چالیس سال کے طول طویل عرصہ کو تو چھوڑیئے، ۱۹۷۶ء کے ایک سال میں، جسے ان کی پیدائش کے صد سالہ جشن کے طور پر منایا گیا، ان موضوعات پر جس قدر کہا، لکھا اور شائع کیا گیا، وہ اعداد و شمار کے احاطہ میں بمشکل سما سکے گا۔ لیکن اربابِ فکر و نظر اس کی تصدیق کریں گے کہ، اس کے باوجود، اقبالؒ نے اپنے آخری وقت میں جو کہا تھا وہ آج بھی اسی قدر مبنی برحقیقت ہے جس قدر ان کی وفات کے وقت تھا۔ مطالعۂ اقبالؒ کے سلسلہ میں، بنیادی طور پر یہ متعین کیا جانا ضروری تھا کہ ان کی فکر کا سرچشمہ کیا تھا۔ اس موضوع پر بھی آپ دیکھیں گے کہ کچھ کم نہیں لکھا گیا ـــــ اس کے ڈانڈے کہیں "مغرب کے سیاروں" سے ملائے گئے، کہیں "مشرق کے ثوابت" سے ـــــ لیکن اصل حقیقت کی طرف کسی کی نگاہ نہ اٹھی۔ حالانکہ اسے حضرت علامہؒ نے اپنی

اقبالؒ کی اوّلیں دعا

سب سے پہلی تصنیف ـــــ مثنوی اسرار و رموز ـــــ میں واضح الفاظ میں بتا دیا تھا۔ انہوں نے کتاب کے آخر میں، "عرضِ حالِ مصنف بحضور رحمتہ اللعالمینؐ" کے زیرِ عنوان کہا تھا :-

گر دلم آئینۂ بے جوہر است　ور بحرفم غیرِ قرآں مضمر است

پردۂ ناموسِ فکرم چاک کن　　　این خیاباں را ز خارم پاک کن
تنگ کن رختِ حیات اندر برم　　　اہلِ ملّت را نگہدار از شرم
سبز کشتِ نابسامانم مکن　　　بہرہ گیر از ابرِ نیسانم مکن
خشک گرداں بادہ در انگورِ من　　　زہر ریز اندر مئے کافورِ من

اور اس کے بعد اپنے لئے وہ بد دعا کہ جس سے زیادہ جگر پاش اور قلب سوز بد دعا' اقبال اپنے حق میں کرنہیں سکتا تھا۔ (اور میں تو اکثر سوچا کرتا ہوں کہ اس بد دعا کی ان میں ہمت کیسے پیدا ہو گئی، اور ان الفاظ کو وہ زبان تک کیسے لے آئے!) کہ:؎

روزِ محشر خوار و رسوا کن مرا　　　بے نصیب از بوسۂ پا کن مرا

"بے نصیب از بوسۂ پا کن مرا" کی درد انگیزی اور جگر گدازی کا اندازہ وہ حضرات بخوبی لگا سکیں گے جنہیں اس کا علم ہے کہ حضورؐ نبیٔ اکرم کی ذاتِ اقدس و اعظم کے ساتھ اقبالؒ کے عشق کی کیفیت کیا تھی۔ اقبالؒ کا، بحضور رحمتہ اللعالمینؐ یہ عرضداشت پیش کرنا کہ، جو کچھ میں نے کہا ہے، اور جو کچھ میں کہوں، اگر اس میں غیرِ قرآن کچھ بھی مضمر ہو تو ——— بے نصیب از بوسۂ پا کن مرا، اس موضوع پر حرفِ آخر کی حیثیت رکھتا ہے۔

اس منفیانہ انداز کے بعد، انہوں نے مثبت طور پر کہا کہ:؎

گر دُرِ اسرارِ قرآں سفتہ ام　　　با مسلماناں اگر حق گفتہ ام
اے کہ از احسانِ تو ناکس، کس است　　　یک دعایت مزدِ گفتارم بس است
عرض کن پیشِ خدائے عزّ و جل　　　عشقِ من گردد ہم آغوشِ عمل
دولتِ جانِ حزیں بخشیدۂ　　　بہرۂ از علمِ دیں بخشیدۂ
در عمل پائندہ تر گرداں مرا
آبِ نیسانم، گہر گرداں مرا　　　(رموز و اسرار۔ ص ۱۹۵-۹۶)

اسی حقیقت کو وہ دوسرے مقام پر ان الفاظ میں بیان کرتے ہیں کہ:؎

برخور از قرآں اگر خواہی ثبات　　　در ضمیرش دیدہ ام' آبِ حیات
از تب و تابم نصیبِ خود بگیر　　　بعد ازیں نآید چو من مردِ فقیر
گوہرِ دریائے قرآں سفتہ ام　　　شرحِ رمزِ صبغۃ اللہ گفتہ ام　　　(مسافر۔ ص ۴۳)

وہ، ارمغانِ حجاز میں، شعرائے عرب کو ایک پیغام دیتے ہیں کہ:؎

بگو از من نوا خوانِ عرب را　　　بہائے کم نہادم لعلِ لب را
ازاں نورے کہ از قرآں گرفتم　　　سحر کردم صد و سی سالہ شب را　　　(ص ۱۱۴)

جاوید نامہ میں "نوائے سروش" کے زیرِ عنوان، کہتے ہیں:؎

چوں سرمۂ رازی را از دیدہ فرو شستم　　　تقدیرِ امم دیدم' پنہاں بکتاب اندر　　　(ص ۴۳)

اقبالؒ کے ہاں، کتاب سے مراد، کتابِ خداوندی' قرآنِ مجید ہی ہوتی ہے۔ بالِ جبریل میں کہتے ہیں:؎

تھا ضبط بہت مشکل اس سیلِ معانی کا ۔۔۔ کہہ ڈالے قلندر نے اسرارِ کتاب آخر (ص۸۷)

وہ بصد حسرت کہتے ہیں کہ :-

کس نمی داند ز اسرارِ کتاب ۔۔۔ شرقیاں ہم غربیاں در پیچ و تاب (جاوید نامہ ص۸۶)

وہ انقلابِ روس کے بانیوں سے پہلے پوچھتے ہیں کہ :-

اے کہ می خواہی نظامِ عالمے ۔۔۔ جُستۂ اورا اساسِ محکمے ؟

اور اس کے بعد انہیں کہتے ہیں کہ :-

داستانِ کہنہ شستی باب باب ۔ ۔۔۔ فکر را روشن کن از اُمّ الکتاب (جاوید نامہ ص۸۸)

عظیم تحفہ ان کی نگاہوں میں قرآنِ کریم کی عظمت کس قدر تھی، اس کا اندازہ اس سے لگائیے کہ جب وہ شاہِ افغانستان نادر شاہ (مرحوم) کی دعوت پر کابل تشریف لے گئے، تو ان کے لئے ایک ہی تحفہ اپنے ساتھ لے کر گئے۔ وہ تحفہ کیا تھا، فرماتے ہیں :-

در حضورِ آں مسلمانِ کریم ! ۔۔۔ ہدیہ آوردم ز قرآنِ عظیم
گفتم ایں سرمایۂ اہلِ حق است ۔۔۔ در ضمیرِ او حیاتِ مطلق است

اس کے جواب میں شاہِ مرحوم نے کہا :-

گفت "نادر در جہاں بیچارہ بود ۔۔۔ از غمِ دین و وطن آوارہ بود
کوہ و دشت از اضطرابم بے خبر ۔۔۔ از غمانِ بے حسابم بے خبر
غیر قرآں غمگسارِ من نہ بود
قوتش ہر باب را بر من کشود" (مسافر ص۱۵-۱۴)

وہ جب ستمبر ۱۹۳۱ء میں، راؤنڈ ٹیبل کانفرنس میں شرکت کے لئے عازمِ لندن ہوئے تو راستے میں کچھ وقت کے لئے دہلی رکے۔ اہلِ دہلی نے ان کی خدمت میں بہت سے سپاسنامے پیش کئے۔ آپ نے جامع مسجد، دہلی، کے امام، شمس العلماء مولانا سید احمد (مرحوم) کے سپاسنامہ کے جواب میں فرمایا :-

جہاں تک سیاسی مسائل کا تعلق ہے میں آپ کو بتا دینا چاہتا ہوں کہ نہ میرے ساتھ کوئی پرائیویٹ سیکرٹری ہے جو میرے لئے ضروری مواد فراہم کرے، نہ میرے پاس سیاسی لٹریچر کا کوئی پلندہ ہے جس پر میں اپنی بحثوں کی اساس قائم کروں۔ میرے پاس حق و صداقت کی ایک جامع کتاب (قرآنِ پاک) ہے جس کی روشنی میں، میں مسلمانانِ ہند کے حقوق کی ترجمانی کرنے کی کوشش کروں گا۔ (گفتارِ اقبالؒ، از محمد رفیق افضل ۔ ص۱۳۶)

اپنے مسلک کے متعلق علامہ سید سلیمان ندوی (مرحوم) کو ایک خط میں لکھتے ہیں :-

اگرچہ یورپ نے مجھے بدعت کا چسکا ڈال دیا ہے تاہم مسلک میرا وہی ہے جو قرآن کا ہے اور جس کو آپ نے آیت شریفہ کے حوالے سے بتایا ہے۔ (اقبالؒ نامہ ۔ حصہ اول ۔ ص۱۳۰)

ان چند تصریحات سے آپ نے دیکھ لیا ہوگا کہ اقبالؒ اپنی فکر اور پیغام کا سرچشمہ قرآنِ کریم بتاتے ہیں۔ اس کے بعد آپ سوچئے کہ ہمیں ان کی فکر کی اساس کی تلاش میں مارے مارے پھرنے کی کیا ضرورت ہے۔ انہوں نے اس حقیقت

کو ایسے واضح انداز سے واشگاف کیا ہے کہ اس میں نہ کوئی ابہام ہے نہ التباس۔ نہ شک ہو سکتا ہے نہ ریب۔ یہ صحیح ہے کہ اقبالؒ بالآخر ایک انسان تھے اور اس جہت سے قرآن کریم کے مفہوم کے سمجھنے میں بعض اوقات ان سے غلطی بھی ہو سکتی ہے اور سہو بھی۔ انہوں نے اس سے کبھی انکار نہیں کیا۔ میں نے قرآنِ مجید کے صحیح طور پر سمجھنے کا طریق خود حضرتِ علاّمہ سے سیکھا ہے۔ میرے دل میں ان کی جس قدر عظمت اور احترام ہے اس سے ایک زمانہ واقف ہے۔ لیکن اس کے باوجود، بعض مقامات پر، ان کی فکرِ قرآن سے مَیں بھی اختلاف رکھتا ہوں۔ اور اسی طرح ہو سکتا ہے کہ دیگر قرآنی ذوق رکھنے والے حضرات بھی ان سے اختلاف کریں۔ لیکن اس کے باوجود، یہ حقیقت اپنے مقام پر محکم ہے کہ انہوں نے اپنی فکر کا سرچشمہ قرآنِ کریم ہی قرار دیا ہے، اور وہ ساری عمر قرآن ہی کے حقائق اور پیغام عام کرنے کی کوشش کرتے رہے۔ یہ ہماری حرماں نصیبی ہے کہ وہ قرآنِ مجید کے حقائق سے متعلق نثر میں کوئی کتاب نہ لکھ سکے۔ وہ مقدمۃ القرآن کے عنوان سے ایک کتاب لکھنا چاہتے تھے لیکن افسوس کہ ان کی یہ آرزو بھی پوری نہ ہو سکی۔ وہ جب علاج کی غرض سے، بھوپال تشریف لے گئے ہیں، تو انہوں نے (۲۲ رجولائی ۱۹۳۰ء کو) تاثیر (مرحوم) کے نام اپنے ایک خط میں لکھا تھا کہ:-

> اعلیٰ حضرت نواب صاحب بھوپال نے نہایت دردمندی سے میرا علاج کرایا ہے۔ اس کے علاوہ، جب ان کو سراس مسعود سے معلوم ہوا کہ میں ایک کتاب مقدمۃ القرآن لکھنا چاہتا ہوں تو اس ارادے کی تکمیل کے لئے مجھے انہوں نے تا حیات پانچ سو روپیہ ماہوار کی لٹریری پنشن عطا فرمائی ہے۔ آپ کو شاید اس کا علم اخباروں سے ہو گیا ہو گا۔ اب ذرا صحت اچھی ہو لے تو انشاء اللہ اس کتاب کو لکھنا شروع کرونگا۔
>
> (انوارِ اقبالؒ۔ بشیر احمد ڈار۔ ص ۲۰۵)

قوم کی بدقسمتی کہ ان کی صحت نے اس کی اجازت ہی نہ دی کہ وہ اپنی اس آرزو کو پورا کر سکتے۔ اگر وہ اس کتاب کو لکھ جاتے تو وہ قرآن فہمی کے سلسلہ میں ایسی متاعِ گراں بہا ہوتی جس کا اندازہ نہیں کیا جا سکتا۔ انہوں نے زبانِ شعر میں بہت کچھ کہا ہے۔ لیکن اس سے قرآنی حقائق مربوط شکل میں سامنے نہیں آ سکتے۔ دوسرے، شاعری میں تضاد بھی واقع ہو جاتا ہے۔ لطائف میں تو اس سے چنداں ہرج نہیں ہوتا لیکن حقائق کی صورت میں تضاد بہت بڑا نقص ہوتا ہے۔ قرآنی حقائق، مربوط شکل میں، بلا تضاد، نثری تخلیق ہی میں بیان کئے جا سکتے تھے۔ لیکن افسوس ہے کہ ایسا نہ ہو سکا۔ اور یہ ایک ایسا خلا ہے جو کبھی پُر نہیں ہو سکے گا۔ اس کے لئے ہم اس سے زیادہ کیا کہہ سکتے ہیں کہ:ـ

آئے عشاق، گئے وعدۂ فردا لے کر — اب انہیں ڈھونڈھ چراغِ رخِ زیبا لے کر (بانگِ درا)

اس مقام پر اس جرأتِ عرض کی اجازت چاہتا ہوں کہ اس مردہ پرست قوم نے جس قدر اقبالؒ کے مزار کی تعمیر اور ان کے جشنِ پیدائش منانے پر صرف کیا ہے، اگر اس کا عشرِ عشیر بھی ان کے علاج اور سفر یورپ کے لئے مہیا کر دیتی، تو معلوم وہ کس قدر گوہر ہائے تابدار سے اس کی جھولیاں بھر دیتے۔ انہوں نے سچ کہا تھا کہ:ـ

مرا سبو چہ غنیمت ہے اس زمانے میں — کہ خانقاہ میں خالی ہیں صوفیوں کے کدو

(بالِ جبریل۔ ص ۱۹)

بہرحال، اس سے واضح ہے کہ فکرِ اقبالؒ کما حقہٗ سمجھ میں نہیں آسکتا تاوقتیکہ اس فکر کے سرچشمہ (قرآنِ مجید) پر گہری نظر نہ ہو۔

تلاوتِ قرآنِ پاک

حضرت علامہؒ، قرآنی حقائق پر غور و فکر میں تو ہر وقت مستغرق رہتے ہی تھے، لیکن اس کے ساتھ انہوں نے تلاوتِ قرآنِ پاک کا بھی عمر بھر التزام رکھا۔ فطرت نے انہیں لحنِ داؤدی عطا فرمایا تھا اس لئے ان کی قرأت میں بڑا سوز و گداز ہوتا تھا۔ اور اس سے وہ خود بھی کیف یاب و سرشار ہوتے تھے۔ عمر کے آخری دور میں، ان کا گلا (قریب قریب) بند ہو گیا۔ اس کا انہیں ایک ہی صدمہ تھا۔ اور وہ یہ کہ :-

در نفس سوزِ جگر باقی نماند لطفِ قرآنِ سحر باقی نماند

(پس چہ باید کرد ...... ص ۶۸)

لیکن ان کی یہ تلاوت، لفظی لفاخوانی نہیں ہوتی تھی۔ وہ رموز و غوامضِ قرآن کی گہرائیوں میں اترتے تھے۔ اس ضمن میں انہوں نے اپنی زندگی کا ایک اہم واقعہ بیان کیا جو انتہائی غور و فکر کا متقاضی ہے۔ ہوا یوں کہ انٹر کالجیئیٹ مسلم برادرہڈ کے زیرِ اہتمام (۹ رجنوری ۱۹۳۸ء کو) منعقد ہونے والے اقبال ڈے کی تقریب میں شرکت کے لئے "اقبالیین" دہلی کا ایک قافلہ، زیرِ قیادت، علامہ حافظ اسلم جیراج پوریؒ لاہور آیا۔ اس میں میرے علاوہ، شیخ سراج الحق صاحب۔ اسد ملتانی (مرحوم) اور قاضی محمد اشرف (مرحوم) شامل تھے۔ ۱۰ رجنوری کی صبح حضرت علامہؒ نے ہمیں شرفِ باریابی عطا فرمایا۔ اس محفل کی یاد میرے لئے سرمایۂ حیات ہے۔ محترمی سید نذیر نیازی نے اس کی روئداد، اپنی کتاب "اقبالؒ کے حضور" میں بڑی تفصیل سے بیان کی ہے۔ واقعہ زیرِ نظر کے سلسلہ میں انہوں نے لکھا ہے :-

(حضرت علامہ نے فرمایا) - میرا معمول تھا کہ ہر روز نمازِ فجر کے بعد قرآنِ مجید کی تلاوت کرتا۔ اس دوران میں والدِ ماجد بھی مسجد سے تشریف لے آتے اور مجھے تلاوت کرتے دیکھ کر اپنے کمرے میں چلے جاتے۔ میں کبھی ایک منزل ختم کر چکا ہوتا کبھی کم۔ ایک روز کا ذکر ہے، والد ماجد حسبِ معمول مسجد سے واپس آئے۔ مَیں تلاوت میں مصروف تھا۔ مگر وہ، جیسے کسی خیال میں میرے پاس بیٹھ گئے۔ میں تلاوت کرتے کرتے رک گیا اور منتظر تھا کہ مجھ سے کیا ارشاد فرماتے ہیں۔ کہنے لگے، تم کیا پڑھا کرتے ہو ؟ مجھے ان کے اس سوال پر نہایت تعجب ہوا، بلکہ ملال بھی۔ انہیں معلوم تھا کہ میں قرآن پاک کی تلاوت کر رہا ہوں۔ بہرحال میں نے مؤدبانہ عرض کیا۔ قرآنِ پاک ..... کہنے لگے، تم جو کچھ پڑھتے ہو، سمجھتے بھی ہو۔ میں نے کہا، کیوں نہیں۔ تھوڑی بہت عربی جانتا ہوں۔ کچھ نہ کچھ سمجھ لیتا ہوں۔ انہوں نے میرا جواب خاموشی سے سنا اور اٹھ کر اپنے کمرے میں چلے گئے۔ میں حیران تھا کہ آخر اس سوال سے ان کا مطلب کیا ہے۔ کچھ دن گذر گئے اور یہ بات جیسے آئی گئی ہو گئی۔ لیکن اس واقعہ کا چھٹا روز تھا کہ میں صبح سویرے حسبِ معمول قرآنِ پاک کی تلاوت کر رہا تھا۔ والدِ ماجد مسجد سے واپس آئے اور میں نے تلاوت ختم کی تو انہوں نے مجھے بلایا اور

اپنے پاس بٹھا کر بڑی نرمی سے کہنے لگے۔ بیٹا! قرآنِ مجید وہی شخص سمجھ سکتا ہے جس پر اس کا نزول ہو۔ مجھے تعجب ہوا کہ حضور رسالتمآب ﷺ کے بعد قرآنِ پاک کیسے کسی پر نازل ہو سکتا ہے۔ معلوم ہوتا ہے، وہ میرے دل کی بات سمجھ گئے۔ کہنے لگے، تمہیں کیسے یہ خیال گزرا کہ اب قرآنِ مجید کسی پر نازل نہیں ہوگا۔ کیوں نہ تم اس کی تلاوت اس طرح کرو جیسے وہ تم پر نازل ہو رہا ہے۔ ایسا کرو گے تو یہ تمہارے رگ و پے میں سرایت کر جائے گا۔ (اس کے بعد اس نکتہ کی مزید وضاحت کرتے ہوئے، حضرت علامہؒ کے والد ماجد نے فرمایا) حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا اسوۂ حسنہ و کاملہ ہی ہر اعتبار سے ہمارے لئے حجت، مثال اور نمونہ ٹھہرا۔ اب جتنا بھی کوئی اس رنگ میں رنگتا چلا جائے گا اتنا ہی قرآنِ مجید اس پر نازل ہوتا رہے گا۔ یہ مطلب تھا میرے اس کہنے کا کہ قرآنِ مجید اس کی سمجھ میں آ سکتا ہے جس پر اس کا نزول ہو۔
(ص ۶۱ - ۶۰)

مطلب یہ تھا کہ قرآنِ مجید کو محض ذہنی طور پر نہ سمجھا جائے بلکہ اس کے مقصود و منتہیٰ کو دل کی گہرائیوں میں پیوست کیا جائے۔ اس سے انسانی ذات میں عجیب تغیر واقع ہوگا۔ یہ دیکھنے کے لئے کہ یہ تغیر کس حد تک پیدا ہو چکا ہے اور اس کی سمت کس طرف کو ہے، یہ دیکھنا چاہیئے کہ وہ حضور نبی اکرم ﷺ کے اسوۂ حسنہ کے کس حد تک مطابق ہے۔ قرآن فہمی کے اسی مقصود کے متعلق حضرت علامہ نے کہا ہے کہ قرآن کی کیفیت یہ ہے کہ:ؔ

چوں بجاں در رفت، جاں دیگر شود — جاں چو دیگر شد، جہاں دیگر شود (جاوید نامہ ص ۹)

نزولِ کتاب

اسی کو آپ نے "نزولِ کتاب" سے تعبیر کیا ہے۔ جہاں فرمایا کہ:ؔ

تیرے ضمیر پہ جب تک نہ ہو نزولِ کتاب
گرہ کشا ہے نہ رازی نہ صاحبِ کشاف
(بالِ جبریل ص ۱۱۲)

دوسری جگہ کہا ہے:ؔ

خرد نے کہہ بھی دیا لاالٰہ تو کیا حاصل — دل و نگاہ مسلماں نہیں تو کچھ بھی نہیں

اس میں ایک یہ نکتہ بھی پنہاں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے، نزولِ قرآن کے سلسلہ میں، قرآن کا مہبط، قلبِ نبوی ﷺ قرار دیا ہے، جہاں فرمایا کہ: فَاِنَّهٗ نَزَّلَهٗ عَلٰى قَلْبِكَ۔ (۲/۹۷) "جبریل نے اسے تیرے قلب پر نازل کیا"۔ لہٰذا جب قرآنی حقائق انسان کے قلب کی گہرائیوں میں اتر جائیں، تو اس وقت کہا جا سکے گا کہ قرآن گویا اس پر نازل ہو رہا ہے ——— یعنی اس کے ذہن سے اس کے قلب پر اتر رہا ہے۔ اس وقت انسان کے افکار و کردار، قرآن کے سانچے میں ڈھل جاتے ہیں۔ یہ وہ "مردِ مسلمان" ہے جس کے متعلق اقبالؒ نے کہا ہے کہ:ؔ

یہ راز کسی کو نہیں معلوم کہ مومن — قاری نظر آتا ہے حقیقت میں ہے قرآن
(ضربِ کلیم۔ ص ۵۷)

پھر یہ بھی ایک عظیم حقیقت ہے کہ قرآنِ کریم کے ذریعے، خدا اور بندے کے درمیان، عجیب و غریب تعلق پیدا ہوتا ہے۔ خدا کی طرف سے براہِ راست علم ملنے کو وحی سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ وحی، حضرات انبیاءِ کرام ؑ کے لئے مختص تھی اور اس کا سلسلہ حضور ﷺ کی ذاتِ گرامی پر ختم ہو گیا۔ وحی کو خدا کی طرف سے ہم کلامی کہہ کر بھی پکارا گیا ہے جہاں کہا ہے۔

وَكَلَّمَ اللّٰهُ مُوْسٰى تَكْلِيْمًا۔ (4/164) اور اس نے قرآن مجید کو بھی كَلَامَ اللّٰهِ (9/6) کہا ہے۔ اب

خدا سے ہم کلامی

ظاہر ہے کہ جب اللہ تعالیٰ (قرآن مجید میں) يَا اَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا (یا بلکہ) يَا اَيُّهَا النَّاسُ کہتا ہے تو اس کا مطلب یہی ہے کہ خدا بندے سے ہم کلام ہوتا ہے۔ دوسری طرف، انسان جب خدا سے کوئی سوال کرتا ہے تو وہ (قرآن کریم کے ذریعے) اسے اس سوال کا جواب دیتا ہے: اُجِيْبُ دَعْوَةَ الدَّاعِ اِذَا دَعَانِ (2/186) کا یہی مطلب ہے۔ لہٰذا قرآن کے ذریعے، انسان کو خدا سے ہم کلامی کا شرف حاصل ہو جاتا ہے۔ اور یہ شرف بڑا عظیم ہے۔

واضح رہے کہ ختمِ نبوت کے بعد، خدا، انسان سے صرف قرآن کریم کے ذریعے ہم کلام ہوتا ہے۔ اس کے سوا، خدا سے ہم کلامی کا کوئی طریق نہیں۔ کشف اور الہام وغیرہ کی کوئی سند قرآن سے نہیں ملتی۔

بہرحال، علامہ اقبالؒ قرآن کی تلاوت اس انداز سے کرتے تھے کہ وہ شعور کے راستے قلب کی گہرائیوں میں اتر جاتے۔ بایں ہمہ انہیں کشف و الہام کا کوئی دعویٰ نہیں تھا۔ چونکہ کائناتی حوادث قوانینِ خداوندی کے مطابق ظہور پذیر ہوتے ہیں اور قرآن کریم میں غور و تدبر سے انسان ان قوانین کی کارفرمائی کو سمجھنے لگ جاتا ہے اس لئے اُسے قرائن و شواہد سے آنے والے واقعات کا کچھ کچھ اندازہ ہو سکتا ہے۔ علامہ اقبالؒ کو تدبر فی القرآن سے اسی قسم کی بصیرت حاصل تھی۔ اسے وہ ان الفاظ میں بیان کرتے ہیں ؎

حادثہ وہ جو ابھی پردۂ افلاک میں ہے   عکس اس کا میرے آئینۂ ادراک میں ہے

یہاں انہوں نے "آئینۂ ادراک" کہا ہے۔ (یعنی فکر و شعور)۔ کشف و الہام یا علمِ باطنی نہیں کہا۔

قرآن کا تعارف

اب یہ دیکھئے کہ حضرت علامہ، قرآن مجید کا تعارف کس کس انداز سے کراتے ہیں۔ اس باب میں انہوں نے جو کچھ کہا ہے اس سے بادنیٰ تعمق یہ حقیقت واضح ہو جائے گی کہ وہ کارگہِ فکر میں ڈھلے ہوئے الفاظ نہیں جن کی نمود میکانکی طور پر ہو جاتی ہے۔ وہ دل کی گہرائیوں سے ابھرنے والے گہر تابدار ہیں جو جذب و کیف کی ایک دنیا اپنے جلو میں لئے، وجۂ تابانیٔ قلوب و اذہان ہوتے ہیں۔ وہ اپنی پہلی تصنیف — "اسرار و رموز" — میں کہتے ہیں: ؎

توہمی دانی کہ آئینِ تو چیست ؟   زیرِ گردوں سرِ تمکینِ تو چیست ؟
آں کتابِ زندہ قرآنِ حکیم   حکمتِ او لایزال است و قدیم
نسخۂ اسرارِ تکوینِ حیات   بے ثبات از قوتش گیرد ثبات
حرفِ او را ریب نے، تبدیل نے   آیہ اش شرمندۂ تاویل نے
پختہ تر سودائے خام از زورِ او   در فتد با سنگ ہام از زورِ او
نوعِ انساں را پیامِ آخریں   حاملِ او رحمۃ للعالمینؐ (رموز)

قرآنی آئین و نظام کے اتباع سے انسان کے اندر جو تبدیلی واقعہ ہوتی ہے اس کا ذکر کرتے ہوئے کہتے ہیں: ؎

خستہ باشی؟ استوارت می کند   پختہ مثلِ کوہسارت می کند

گر زمینی! آسماں سازد ترا　　آنچہ حق می خواہد آں سازد ترا

"آنچہ حق می خواہد آں سازد ترا" —— اس ایجاز میں جس قدر اطناب پوشیدہ ہیں، ان کا اندازہ اربابِ نظر ہی لگا سکتے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ قرآنی تعلیم کے اثمار و نتائج کے متعلق اس سے بہتر اور برجستہ شاید ہی کچھ اور کہا جا سکے اس میں، مشیتِ خداوندی کے مقصود و مطلوب کی پوری دنیا سمٹ کر آگئی ہے —— آنچہ حق می خواہد آں سازد ترا ——

گفتار میں، کردار میں، اللہ کی برہان

"اسرار و رموز" ہی میں دوسری جگہ کہتے ہیں :-

قلبِ مومن را کتابش قوت است　　حکمتش حبل الورید ملت است　　(ص ۱۱۷)

قرآن، انفرادی طور پر کس قسم کی قلب ماہیت پیدا کرتا ہے، اور امت کی اجتماعی زندگی میں کس قدر محکمیت کا ضامن بنتا ہے،" اس ایک شعر میں دونوں خصوصیات سمو کر رکھ دی گئی ہیں :-

وہ، مثنوی مسافر میں رقمطراز ہیں :-

برخور از قرآں اگر خواہی ثبات　　در ضمیرش دیدہ ام آبِ حیات

می دھد مارا پیام لاتخف　　می رساند بر مقامِ لاتخف　　(ص ۴۳)

حضرات انبیاءِ کرامؑ، عظیم آسمانی انقلاب کے داعی ہوتے تھے۔ ان کی انقلابی دعوت کے خلاف، مفاد پرست قوتیں ہجوم کر کے امڈ آتی تھیں۔ ان کے ساتھ تزاحم و تخاصم کی ہنگامہ آرائیاں بڑی ہمت طلب اور صبر آزما ہوتی تھیں۔ ان مقامات پر، انہیں خدا کی طرف سے سکینت و طمانیتِ قلب کے اس قسم کے پیغامات موجبِ حوصلہ افزائی ہوتے تھے کہ: لَا تَخَفْ اِنَّكَ اَنْتَ الْاَعْلٰى - (۲۰/۶۸) "تم خوف زدہ مت ہو، آخر الامر تم ہی غالب آؤ گے۔"

کم و بیش یہی الفاظ قرآن کریم نے جماعتِ مومنین کے لئے کہے ہیں۔ ان سے کہا ہے کہ ہجومِ مشکلات سے گھبراؤ نہیں۔ لَا تَهِنُوْا وَلَا تَحْزَنُوْا وَاَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ - (۳/۱۳۹) "جب تمہارا قرآن کی صداقتوں پر ایمان ہے تو پھر گھبرانے اور خوف کھانے کی کونسی بات ہے۔ تم ثابت قدم رہو۔ آخر الامر تمہیں غالب آؤ گے۔"

قرآن کی عظمت

انہوں نے جاوید نامہ میں، قرآنِ کریم کی حقیقت و عظمت کو بڑے دلآویز انداز میں بیان کیا ہے :-

فاش گویم آنچہ در دل مضمر است　　ایں کتابے نیست چیزے دیگر است

قرآن مجید کے تفصیلی تذکرہ کے لئے اگر ضخیم تصنیفات بھی قلم بند کی جائیں، تو جو بات "چیزے دیگر است" میں کہی گئی وہ ان ضخیم مجلدات میں بھی سما نہ سکے۔ اس جامعیت میں تو حقائق و رموز کی ایک دنیا جھلمل جھلمل کر رہی ہے یہ وہ آنکھ کی پتلی (مردمِ دیدہ) ہے جس میں آسمان سمٹ کر آجاتا ہے۔ امیر خسروؒ نے اپنے محبوب کے متعلق کہا تھا کہ :-

آفاقہا گردیدہ ام، مہر بتاں ورزیدہ ام!　　بسیار خوباں دیدہ ام، اما تو چیزے دیگری

اقبالؒ نے یہی الفاظ قرآن کے متعلق کہہ کر، بتا دیا کہ اس کا محبوب کون ہے، اور کیا ہے؛ اس شعر کو پھر پڑھئے کیونکہ

اس کا مفہوم اُس شعر کو ساتھ ملانے سے نمایاں ہو سکے گا جو اس کے بعد آیا ہے :۔

فاش گویم آنچہ در دل مضمر است این کتابے نیست، چیزے دیگر است
چوں بجاں در رفت، جاں دیگر شود جاں چو دیگر شد، جہاں دیگر شود (صفحہ ۹)

"جاں چو دیگر شد، جہاں دیگر شود"۔ قرآنِ کریم کے ایک عظیم فلسفۂ حیات و لائحہ انقلاب کی تفسیر ہے۔ اس نے قوموں کی زندگی میں انقلاب آفرینی کا راز یہ بتایا ہے کہ: اِنَّ اللّٰہَ لَا یُغَیِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتّٰی یُغَیِّرُوْا مَا بِاَنْفُسِہِمْ۔ (۱۳/۱۱) یاد رکھو! (تم خود تو کجا) خدا بھی کسی قوم کے احوال و ظروف میں تبدیلی پیدا نہیں کرتا جب تک وہ قوم اپنے اندر نفسیاتی تبدیلی پیدا نہیں کرتی۔ قوم کی خارجی دنیا میں انقلاب آ نہیں سکتا جب تک وہ اپنی داخلی دنیا میں ——— انقلاب نہ پیدا کر لے۔ جب تک کسی قوم کے قلب و دماغ، اس کی فکر و نظر، اس کے تصورات و تخیلات، اس کی اقدارِ حیات، اس کے نصب العین زندگی میں تبدیلی نہیں پیدا ہو جاتی، اس کی خارجی دنیا میں تبدیلی نہیں آ سکتی۔ قوموں کی خارجی دنیا، ان کی داخلی دنیا کے سانچے میں ڈھلتی ہے۔ جس قسم کی ان کی داخلی دنیا، اسی قسم کی ان کی خارجی دنیا۔ علامہ اقبالؒ پیامِ مشرق کے دیباچہ میں لکھتے ہیں کہ "زندگی اپنے حوالی میں کسی قسم کا انقلاب پیدا نہیں کر سکتی جب تک کہ پہلے اس کی اندرونی گہرائیوں میں انقلاب نہ ہو، اور کوئی نئی دنیا خارجی وجود اختیار نہیں کر سکتی جب تک کہ اس کا وجود پہلے انسانوں کے ضمیر میں متشکل نہ ہو"۔ بنا بریں جب قرآنی اقدار کسی قوم کے قلب کی گہرائیوں میں اتر جائیں، تو اس کی خارجی دنیا میں انقلاب آ جاتا ہے ؎

چوں بجاں در رفت جاں دیگر شود جاں چو دیگر شد، جہاں دیگر شود
اندرو تقدیر ہائے غرب و شرق سرعتِ اندیشہ پیدا کن چو برق (صفحہ ۹۱)

قرآن کی بیان کردہ "تقدیرات" کے سمجھنے کے لئے سرعتِ اندیشہ کی ضرورت ہے۔ اس لئے کہ :۔

جہانِ تازہ کی، افکارِ تازہ سے ہے نمود کہ سنگ و خشت سے ہوتے نہیں جہاں پیدا

جاوید نامہ ہی میں دوسری جگہ کہتے ہیں :۔

چوں مسلماناں اگر داری جگر در ضمیرِ خویش و در قرآں نگر
صد جہانِ تازہ در آیاتِ اوست عصرہا پیچیدہ در آناتِ اوست
یک جہانش عصرِ حاضر را بس است گیر اگر در سینۂ دل معنی رس است
بندۂ مومن ز آیاتِ خدا ست ہر جہاں اندر برِ او چوں قبا ست
چوں کہن گردد جہانے در برش
می دہد قرآں جہانے دیگرش (صفحہ ۷۳-۷۲)

ان آیات میں، جس حسن کارانہ اور معجزانہ انداز سے قرآن کی ابدیت کی وضاحت کی گئی ہے، جوں جوں انسان اس پر غور کرتا ہے، اس کی روح وجد میں آ جاتی ہے۔ یہ نکتہ ذرا تشریح کا محتاج ہے۔ اللہ تعالیٰ نے، نوعِ انسان کو منزلِ انسانیت تک لے جانے والے راستے کی طرف راہ نمائی اپنے ذمہ لی اور اس کے لئے حضرات انبیاءِ کرامؑ کی وساطت سے سلسلۂ رشد و ہدایت جاری کیا۔ جب نوعِ انسان عالمِ طفولیت میں تھی تو اس پروگرام کی صورت یہ تھی کہ اس میں

آسمانی ہدایت کی ابدیت

اصولی ہدایات کم ہوتی تھیں اور عملی جزئیات زیادہ ——— اس زمانے میں تو حالت یہ تھی کہ حضرت نوحؑ کو کشتی بنانے کا طریق بھی بذریعہ وحی بتانا پڑا۔ جوں جوں نوعِ انسان عمر میں بڑھتی گئی اور اس کا شعور پختہ ہونا شروع ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ہوا تو اس پروگرام کی جزئیات میں کمی اور اصولوں میں اضافہ ہوتا گیا۔ تا آنکہ جب وہ عالمِ شباب تک پہنچ گئی اور مشیت نے دیکھ لیا کہ اب انسان اصولوں کی روشنی میں، اپنے وقت کے تقاضوں کے مطابق جزئیات خود مرتب کرنے کے قابل ہو گیا ہے۔ تو اس نے ان تمام اصولوں کو جن کی انسانی راہ نمائی کے لئے ضرورت تھی مکمل شکل میں، وحی کے آخری ضابطہ، قرآنِ کریم میں محفوظ کر دیا، اور سلسلۂ وحی اختتام تک پہنچ گیا۔ (ختمِ نبوت کے یہی معنی ہیں)۔ اب انسانوں کے کرنے کا کام یہ تھا کہ وہ اپنے زمانے کے تقاضوں کو سامنے رکھ کر قرآن میں غور کریں کہ اس نے، ان کے حل کے لئے کیا اصول دیا ہے اور اس اصول پر عمل پیرا ہونے کے طور طریقے خود وضع کریں۔ اس طرح یہ کتابِ ہدیٰ قیامت تک انسانی راہ نمائی کا فریضہ ادا کرتی رہے گی۔ یہ کہیں نہیں کہے گی کہ مجھ میں راہ نمائی دینے کی صلاحیت ختم ہو گئی ہے۔ قرآن سے راہ نمائی حاصل کرنے کے لئے اس طریق کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اللہ تعالٰی نے کہا ہے کہ: سَنُرِيهِمْ آيَاتِنَا فِي الْآفَاقِ وَفِي أَنفُسِهِمْ حَتَّىٰ يَتَبَيَّنَ لَهُمْ أَنَّهُ الْحَقُّ۔ (41/53)۔ "ہم انہیں (نوعِ انسان کو) خارجی کائنات اور خود ان کی داخلی زندگی میں اپنی "نشانیاں" دکھاتے جائیں گے۔ تا آنکہ ان پر یہ حقیقت واشگاف ہو جائے کہ قرآن کا ہر دعویٰ صداقت پر مبنی ہے"۔ یعنی جوں جوں علمِ انسانی آگے بڑھتا جائے گا، قرآنی حقائق بے نقاب ہوتے جائیں گے۔ ایسا ہو سکتا ہے (اور ہوتا ہے) کہ عقل و فکر اور تجربہ و مشاہدہ کی رو سے جن حقائق کا ادراک ہو، انسان انہیں قرآن کے حوالے سے پیش نہ کرے۔ لیکن اس کے باوجود وہ ہوں گے قرآنی حقائق ہی۔ اس لئے کہ یہ ہو نہیں سکتا کہ یہ عالمِ الانفس و آفاق میں کوئی حقیقت بے نقاب ہو، اور وہ قرآن کے خلاف جائے ہماری اس ملاقات میں جس کا میں پہلے ذکر کر چکا ہوں، حضرت علامہؒ نے اس حقیقت کو بڑے لطیف اور دقیق انداز سے ارشاد فرمایا۔ ارشاد ہوا کہ:-

> قرآنی حقائق کے دماغ کی راہ سے سمجھ میں آنے کا مطلب ہے حقائق کا ادراک، علم اور فکر، تجربے اور مشاہدے کی روشنی میں۔ حقائق کا ادراک ہمیشہ سے جاری تھا۔ کبھی ایک حقیقت سمجھ میں آئی کبھی دوسری، کبھی جزءً کبھی تماماً۔ اب اگر انسان وہ سب حقائق جو اس نے اپنے علم اور تجربے کی روشنی میں حاصل کئے ہیں۔ یا جن تک عقل اور فکر کے ذریعے اس کی رسائی ہوئی، باہم فراہم کرے اور ایک مربوط و منظم شکل میں پیش کرے تو ان سے قرآنِ پاک ہی کے ارشادات کی تصدیق اور ترجمانی ہو گی۔

اس کے بعد قدرے توقف سے فرمایا:-

> حقائق کا ادراک ہوتا رہا اور ہوتا رہے گا۔ قرآنِ مجید ان سب حقائق کا جامع ہے جو ہمارے ادراک میں آ چکے ہیں۔ اور ان کا بھی جن کا ادراک باقی ہے۔ خواہ یہ حقائق سنوسی کی زبان سے ادا ہوں، خواہ لینن کی۔ حقائق بہرحال حقائق ہیں۔ ان کو سمجھنے کی جس طرح بھی کوشش کی جائے اپنی جگہ پر ٹھیک

ہے۔ مقصد ان کا سمجھنا ہے اور قبول کرنا ہے۔ لہٰذا، انہیں جس طرح بھی سمجھیں یہ قرآن پاک ہی کا سمجھنا ہوگا اس کی تعلیم سے بہرہ در ہونا ہوگا۔ (اقبالؒ کے حضور۔ ص ۵۸-۵۷)

اسی حقیقت کو انہوں نے جاوید نامہ میں ان عمیق الفاظ میں بیان کیا ہے کہ: ؎

ہر کجا بینی جہانِ رنگ و بو ‏ ‏ ‏ آنکہ از خاکش بروید آرزو !

یاز نورِ مصطفٰے او را بہاست ‏ ‏ ‏ یا ہنوز اندر تلاشِ مصطفٰے است

یہ نورِ مصطفٰے وہی ہے جو حضورؐ نبی اکرم کی وساطت سے دنیا کو ملا اور اب قندیلِ قرآنی میں محفوظ ہے۔ یَہْدِی اللّٰہُ لِنُوْرِہٖ مَنْ یَّشَآءُ ط (۲۴/۳۵)۔

ان تشریحات کی روشنی میں، جاوید نامہ کے ان اشعار کا مطلب سمجھ میں آجائے گا، جنہیں میں نے ابھی ابھی پیش کیا ہے کہ: ؎

صد جہانِ تازہ در آیاتِ اوست ‏ ‏ ‏ عصرہا پیچیدہ در آناتِ اوست

چوں کہن گردد جہانے در برش ‏ ‏ ‏ می دھد قرآں جہانے دیگرش

اس طرح قرآن کے اصول و حقائق، ہر زمانے کے تقاضوں کی تسکین کا سامان فراہم کرتے، اور انسانی زندگی کے ہر مشکل مسئلہ کا حل بتاتے، کاروانِ انسانیت کے راہ نما بنتے چلے جاتے ہیں۔ یہ کسی مقام پر اس کی راہ نمائی سے عاجز نہیں آتے۔ یہی وہ حقیقت تھی جسے، گوئٹے نے، ایکرمن کو ان الفاظ میں سمجھایا تھا کہ:۔

> اسلام کی تعلیم کسی مقام پر بھی ناکام نہیں رہتی۔ ہم اپنے تمام نظامہائے حیات کے ساتھ، اس سے آگے نہیں جا سکتے۔ اور اصل تو یہ ہے کہ کوئی انسان بھی اس سے آگے نہیں جا سکتا۔
>
> (خطباتِ اقبالؒ۔ ص ۸)

یہ ہے قرآن کی ابدیت!

قرآنی انقلاب

یہاں تک تو قرآنی حقائق سے بحث تھی۔ اب سوال یہ ہے کہ ان حقائق، یا قرآنی اصولِ حیات سے نوعِ انسان کو حاصل کیا ہوا؟ ان کے اتباع سے نتیجہ کیا مرتب ہوا، اور کیا مرتب ہوگا۔ اس اہم سوال کا جواب، علامہ اقبالؒ نے دو لفظوں میں نہایت جامعیت سے دیا ہے جہاں کہا کہ:۔

چیست قرآں، خواجہ را پیغامِ مرگ ‏ ‏ ‏ دستگیرِ بندۂ بے ساز و برگ ‏ ‏ ‏ (جاوید نامہ۔ ص ۸۹)

"خواجہ را پیغامِ مرگ" کا مطلب یہ ہے قرآن نے، انسانوں پر دوسرے انسانوں کی ہر قسم کی بالادستی کا خاتمہ کر دیا۔ اسی حقیقت کو انہوں نے، "ابلیس کی مجلسِ شوریٰ" میں، ابلیس کی زبان سے ان الفاظ میں دہرایا ہے کہ: ؎

موت کا پیغام ہر نوعِ غلامی کے لئے ‏ ‏ ‏ نے کوئی فغفور و خاقاں، نے فقیرِ رہ نشیں

کرتا ہے دولت کو ہر آلودگی سے پاک و صاف ‏ ‏ ‏ منعموں کو مال و دولت کا بناتا ہے امیں

اس سے بڑھ کر اور کیا فکر و عمل کا انقلاب! ‏ ‏ ‏ پادشاہوں کی نہیں، اللہ کی ہے یہ زمیں

(ارمغانِ حجاز۔ ص ۲۲۵)

اب آگے بڑھیے۔ حضرت علامہ اس حقیقت کو شرح و بسط سے واضح کرتے ہیں کہ صدرِ اوّل کے مسلمانوں نے جس قدر قوت و حشمت۔ دولت و ثروت۔ شوکت و مملکت۔ رفعت و عظمت اور ان سب کے ساتھ، شرف و مجدِ انسانیت کے مقاماتِ بلند حاصل کئے تو وہ سب اتباعِ قرآن کا نتیجہ تھا۔ اس کے بعد اس قوم نے قرآن کا دامن ہاتھ سے چھوڑ کر "عجمی اسلام" اختیار کر لیا تو اس کی وہ حالت ہوگئی جس کا ہم سب رونا روتے ہیں۔ اقبالؒ کو امتِ مرحومہ کے ساتھ والہانہ محبت تھی۔ اس محبت کا نتیجہ تھا کہ وہ اس کی نکبت و زبوں حالی پر خون کے آنسو بہاتے تھے۔ انہوں نے اس موضوع

امت کی تاریخ

پر اس قدر شدت و تکرار سے لکھا ہے کہ اس سے ایک مستقل تصنیف وجود میں آسکتی ہے۔ لیکن میں اس وقت ان میں سے صرف وہ مقامات پیش کروں گا جن میں انہوں نے براہِ راست قرآن کے حوالے سے بات کی ہے۔ وہ پہلے کہتے ہیں کہ:ؔ

نقشِ قرآں تا دریں عالم نشست   نقش ہائے کاہن و پاپا شکست   (جاوید نامہ صفحہ 9)

اس کے بعد کیا ہوا، غور سے سنئے۔ پہلے اس حقیقت کو با صد حسرت پیش کرتے ہیں کہ:ؔ

منزل و مقصودِ قرآں دیگر است   رسم و آئینِ مسلماں دیگر است!
در دلِ او آتشِ سوزندہ نیست   مصطفٰے در سینۂ او زندہ نیست
بندۂ مومن ز قرآں برنخورد   در ایاغِ او نہ مے دیدم نہ دُرد

اس کے بعد کہتے ہیں کہ کس قدر مقامِ حیرت و تاسف ہے کہ:ؔ

خود طلسمِ قیصر و کسریٰ شکست   خود سرِ تختِ ملوکیت نشست
تا نہالِ سلطنت قوت گرفت   دینِ او نقش از ملوکیت گرفت
از ملوکیت نگہ گردد دگر
عقل و ہوش و رسم و راہ گردد دگر   (جاوید نامہ۔ صفحہ 87)

اس قوم میں اس محیر العقول تبدیلی کا راز، اس ایک نکتہ میں پنہاں ہے کہ ان کی خلافت ملوکیت میں بدل گئی۔ خلافت نے انہیں، ہر نوعِ غلامی سے رستگاری عطا کر دی تھی، ملوکیت نے ان کی آزادی کو سلب کر لیا:ؔ

چوں خلافت رشتہ از قرآں گسیخت   حریت را زہر اندر کام ریخت   (اسرار و رموز۔ صفحہ 127)

اس کا نتیجہ کیا ہوا؟

مومن و پیشِ کساں بستن نطاق   مومن و غداری و فقر و نفاق!
با پشیزے دین و ملت را فروخت   ہم متاعِ خانہ و ہم خانہ سوخت
لا الٰہ اندر نمازش بود و نیست   نازہا اندر نیازش بود و نیست
نور در صوم و صلوٰتِ او نماند   جلوۂ در کائناتِ او نماند
روح چوں رفت از صلوٰۃ و از صیام   فرد ناہموار و ملت بے نظام
سینہ ہا از گرمیٔ قرآں تہی   از چنیں مرداں چہ امیدِ بہی!
ہر کسے بر جادۂ خود تند رَو   ناقہ ما بے زمام و ہرزہ دَو

واحسرتا کہ :

صاحبِ قرآن و بے ذوقِ طلب العجب ۔ ثم العجب ۔ ثم العجب !

(جاوید نامہ ۔ ص ۲۳۵-۲۳۶)

وہ کہتے ہیں کہ سوچئے کہ یہ بات کس قدر ناقابلِ فہم ہے کہ جس قوم کے پاس ایسی کتابِ زندہ موجود ہو، وہ قوم مردہ ہو!
وہ بصد حیرت کہتے ہیں کہ :

رفت سوزِ سینۂ تاتار و کُرد یا مسلماں مُرد یا قرآں بمُرد ؛ (جاوید نامہ ص ۸۴)

وہ مسلمان سے کہتے ہیں :

ز قرآں پیشِ خود آئینہ آویز دگرگوں گشتۂ ! از خویش بگریز
ترازوئے بنہ کردار خود را قیامت ہائے پیشیں را بر انگیز ! (ارمغانِ حجاز ص ۱۰۲)

تحریکِ پاکستان کے دوران ایک عجیب حیرت افزا اور دل خراش حقیقت سامنے آئی ۔ ہندوؤں کا سب سے بڑا لیڈر، (مہاتما) گاندھی تھا جس کی تمام تگ و تاز کا مقصد قدیم ہندو دھرم کا احیاء تھا ۔ اس کے مقابلے میں، قومیت پرست مسلمان لیڈروں کی حالت یہ تھی کہ وہ اسلام کے ایک ایک بنیادی عنصر کو خیرباد کہتے چلے جاتے تھے ۔ کہیں، ڈاکٹر سید محمود اور آصف علی نما لیڈر تھے جو مذہب کو داستانِ پارینہ قرار دیتے تھے ۔ کہیں ڈاکٹر ذاکر حسین خان جیسے ماہرینِ تعلیم تھے جو مہاتما گاندھی کے تجویز کردہ خطوط پر " واردھا کی تعلیمی اسکیم " مرتب فرما رہے تھے ۔ کہیں (امام الہند، مولانا) ابوالکلام آزاد تھے جو اسلام کا برہمو سماجی ایڈیشن پیش کر رہے تھے ۔ کہیں (شیخ الحدیث، مولانا) حسین احمد مدنی جیسے علمائے کرام تھے جو متحدہ قومیت اور سیکولرازم کو عین مطابقِ اسلام قرار دے رہے تھے ۔ یہ تھی وہ سینہ سوز حقیقت جس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے حضرت علامہ نے با صد نالہ و فغاں کہا تھا کہ :

درِ صد فتنہ را بر خود کشادی دو گامے رفتی و از پا فتادی
برہمن از بتاں طاقِ خود آراست تو قرآں را سرِ طاقے نہادی (ارمغانِ حجاز ص ۱۳۶)

اور یہ کہ :

نگہ دارد برہمن کارِ خود را نمی گوید بکس اسرارِ خود را !
بمن گوید کہ از تسبیح بگذر بدوشِ خود بہ دزنارِ خود را (ارمغانِ حجاز ص ۱۳۷)

مُلّا اور قرآن

میرے نزدیک حضرت علامہ کا سب سے بڑا اور معرکہ آرا کارنامہ یہ ہے کہ انہوں نے بکمال جرأت و جسارت اس حقیقت کو طشت از بام کیا کہ امت کو قرآن سے برگشتہ کرنے کی بنیادی ذمہ داری ہماری مذہبی پیشوائیت پر عائد ہوتی ہے جسے وہ ملّا کی اصطلاح سے تعبیر کرتے ہیں ۔ انہوں نے مُلّا کے خلاف جو کچھ کہا ہے وہ کسی خاص مُلّا یا طبقۂ علما کے خلاف نہیں ۔ وہ مذہبی پیشوائیت کی (INSTITUTION) کے خلاف ہے ۔ جس نے اسلام کو کچھ کا کچھ بنا دیا اور اُمت کو تباہ کر دیا ہے ۔ یہ عنوان، ایک مستقل موضوع ہے جسے میں کسی دوسری نشست پر اٹھا رکھنا چاہتا ہوں ۔ اس وقت میں اس کے ان دو ایک ضمنی گوشوں کو سامنے لاؤں گا جن کا تعلق براہِ راست

قرآن سے ہے۔ وہ جاوید نامہ میں، سعید حلیم پاشا کی زبان سے کہتے ہیں: ؎

دینِ حق از کافری رسوا تر است   زانکہ مُلّا مومنِ کافر گر است!
شبنمِ ما در نگاہِ ما یم است   از نگاہِ او یمِ ما شبنم است!
از شگرفیہائے آں قرآں فروش   دیدہ ام روح الامیں را در خروش
زانسوئے گردوں دلش بیگانہ   نزدِ او ام الکتاب افسانہ
بے نصیب از حکمتِ دینِ نبیؐ   آسمانش تیرہ از بے کوکبی!
کم نگاہ و کور ذوق و ہرزہ گرد   ملت از قال و اقولش فرد فرد!

حد یہ کہ: ؎

مکتب و مُلّا و اسرارِ کتاب   کورِ مادر زاد و نورِ آفتاب

دینِ کافر، فکر و تدبیرِ جہاد
دینِ مُلّا فی سبیل اللہ فساد!   (جاوید نامہ۔ ص ۸۴)

وہ، مثنوی "پس چہ باید کرد" میں کہتے ہیں: ؎

مکتب و ملا سخنہا ساختند   مومناں ایں نکتہ را نشناختند
زندہ قومے بود، از تاویل مُرد   آتشِ او در ضمیرِ او فسرد
ہر یکے دانائے قرآن و خبر   در شریعت کم سواد و کم نظر
عقل و نقل افتادہ در بندِ ہوس   منبرِ شاں منبرِ کاک است و بس
ایں کلیماں نیست امیدِ کشود   آستیں ہا بے یدِ بیضا چہ سود   (ص ۴۱-۴۲)

ان کی تاویل کے متعلق کہتے ہیں: ؎

ز من بر صوفی و مُلّا سلامے   کہ پیغامِ خدا گفتند ما را
ولے تاویلِ شاں در حیرت انداخت   خدا و جبرئیل و مصطفیٰؐ را   (ارمغانِ حجاز ص ۱۰۲)

اس کی تشریح ضربِ کلیم میں ان الفاظ میں کی گئی ہے: ؎

خود بدلتے نہیں، قرآں کو بدل دیتے ہیں   ہوئے کس درجہ فقیہانِ حرم بے توفیق   (ص ۱۴)

ان کی ان تاویلات و تغیرات کا نتیجہ ہے کہ: ؎

اسی قرآں میں ہے اب ترکِ جہاں کی تعلیم   جس نے مومن کو بنایا مہ و پرویں کا امیر
"تن بہ تقدیر" ہے آج ان کے عمل کا انداز   تھی نہاں جن کے ارادوں میں خدا کی تقدیر!
تھا جو "ناخوب" بتدریج وہی "خوب" ہوا   کہ غلامی میں بدل جاتا ہے قوموں کا ضمیر   (ضربِ کلیم ص ۸)

پیغام بہ ملّت

ملوکیت اور مذہبی پیشوائیت کی قرآن کے خلاف سازش کا تار و پود بکھیرنے کے بعد، وہ مسلمان سے براہِ راست مخاطب ہوتے ہیں اور اسے دوٹوک الفاظ میں کہتے ہیں کہ: ؎

اے گرفتارِ رسومِ ایمانِ تو　　شیوہ ہائے کافری زندانِ تو
گر تو می خواہی مسلماں زیستن　　نیست ممکن جز بقرآں زیستن

قرآنِ کریم نے، کتاب و حکمت —— یعنی قوانینِ خداوندی اور ان کی غرض و غایت کو منزل من اللہ بتایا ہے جو علم و عقل کی رو سے سمجھ میں آسکتے ہیں۔ یعنی قرآن، مجموعہ ہے کتاب و حکمت کا۔ اس حقیقت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے علامہ اقبالؒ نے مسافر میں کہا ہے: ؎

برگ و سازِ ما کتاب و حکمت است　　این دو قوت اعتبارِ ملت است
آں فتوحاتِ جہانِ ذوق و شوق　　ایں فتوحاتِ جہانِ تحت و فوق
ہر دو انعامِ خدائے لایزال　　مومناں را آں جمال است ایں جلال

اس کے بعد وہ مسلمانوں سے کہتے ہیں: ؎

برخور از قرآں اگر خواہی ثبات　　در ضمیرش دیدہ ام آبِ حیات
می دھد ما را پیامِ لاتخف　　می رساند بر مقامِ لاتخف　　(مسافر۔ ص ۸۵)

وہ خصوصیت سے مغرب زدہؔ مسلمان کو مخاطب کر کے کہتے ہیں: ؎

اے بہ تقلیدش اسیر آزاد شو　　دامنِ قرآں بگیر، آزاد شو　　(جاوید نامہ۔ ص ۸۰)

اب ہم اس موضوع کی طرف آتے ہیں جو فکرِ اقبالؒ میں اساسی حیثیت رکھتا ہے۔ سوال یہ ہے کہ جب خلافت، ملوکیت میں بدل گئی تو اس سے اسلام پر کیا اثر پڑا؟ نظر بظاہر یہ محض سیاسی نظام کی تبدیلی تھی۔ لیکن یہ —— محض سیاسی نظام کی تبدیلی نہیں تھی۔ اس سے اسلام ہی باقی نہیں رہا۔ اسلام، ایک دین ہے (اور دین بھی دین اللہ)۔ ملوکیت سے، یہ دین، مذہب میں تبدیل ہو گیا۔ مذہب نام ہے، خدا اور بندے کے درمیان پرائیویٹ تعلق کا جو (مذہب پرست طبقہ کے عقیدہ کے مطابق) پوجا پاٹ۔ گیان دھیان۔ بھگتی اور پرستش کی رو سے قائم ہو سکتا ہے۔ اس کے پہچاننے اور ماپنے کا کوئی خارجی اور محسوس معیار نہیں۔ یہ خالص انفرادی احساس کا نام ہے۔ اس کے برعکس، دین اس نظامِ حیات کا نام ہے جس میں انسانوں کے انفرادی اور اجتماعی امور کے فیصلے قوانینِ خداوندی کی رو سے ہوتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ اس دین کا قیام اسی صورت میں ممکن ہے کہ امتِ مسلمہ کی اپنی آزاد مملکت ہو جس میں احکام و اصول و اقدار

دین و مذہب

قرآنی کو قوانینِ مملکت کی حیثیت سے نافذ کیا جا سکے۔ اس مملکت کو قرآنی اصطلاح میں "استخلاف فی الارض" کہا جاتا ہے۔ ($\frac{24}{55}$) جس کا مخفف "خلافت" ہے۔ قانون محض الفاظ کا مجموعہ ہوتا ہے۔ اسے ایک مؤثر حقیقت اور زندہ نظام بنانے کے لئے قوتِ نافذہ کی ضرورت ہوتی ہے۔ اگر قانون کے پیچھے قوتِ نافذہ نہ ہو تو وہ وعظ بن کر رہ جاتا ہے۔ قرآن کریم نے اسی لئے کتاب کے ساتھ حدید (فولاد۔ یعنی شمشیر) کو بھی منزل من اللہ کہا ہے۔ سورۂ حدید کی آیت ۲۵ بڑی معنی خیز ہے۔ فرمایا: لَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلَنَا

ؔ "اقبالؒ اور تہذیبِ مغرب" الگ موضوع ہے جس پر میں بہت کچھ لکھ چکا ہوں۔

بِالْبَيِّنٰتِ -" ہم نے رسولوں کو واضح دلائل و براہین کے ساتھ بھیجا۔ یعنی ہدایتِ خداوندی کے نافذ العمل کرنے کی پہلی منزل یہ ہے کہ اسے دلیل و برہان کی رو سے پیش کیا جائے۔ جو لوگ، علم و عقل اور غور و تدبر کے بعد اس کی صداقت کو تسلیم کر لیں، انہیں ضابطۂ قوانین کے تابع لایا جائے۔ وَاَنْزَلْنَا مَعَهُمُ الْكِتٰبَ -" اور ان رسولوں کے ساتھ ہم نے کتاب (ضابطۂ قوانین) بھی نازل کی"۔ اس سے مقصد کیا تھا؟ وَالْمِيْزَانَ لِيَقُوْمَ النَّاسُ بِالْقِسْطِ ۚ مقصد یہ تھا کہ ان کے معاملات کو از روئے عدل و انصاف طے کیا جائے۔ لیکن عدل کا قیام اسی صورت میں ممکن ہوگا جب اس کے فیصلوں کو نافذ کرنے کے لئے قوت بھی موجود ہو۔ اس کے لئے فرمایا، وَاَنْزَلْنَا الْحَدِيْدَ فِيْهِ بَاْسٌ شَدِيْدٌ وَّمَنَافِعُ لِلنَّاسِ ...... (57/25) اور اس مقصد کے لئے ہم نے فولاد (شمشیر) بھی نازل کی۔

قرآن اور شمشیر

اس میں سختی بھی ہوتی ہے اور لوگوں کے لئے منفعت بھی۔ اس کی سختی سے ظالم کو ظلم سے روکا جاتا ہے، اور مظلوم کی داد رسی ہوتی ہے جو اس کے لئے منفعت بخش ہوتی ہے۔

علامہ اقبالؒ کا عظیم کارنامہ یہ ہے کہ انہوں نے اُمتِ مسلمہ کو اس فراموش کردہ حقیقت کی یاد دلائی کہ اسلام مذہب نہیں دین ہے۔ اور دین کے معنی ہیں ایسی آزاد مملکت جو قوانینِ خداوندی کی تنفیذ کے لئے وجود میں لائی جائے۔ انہوں نے پاکستان کا تصور اور مطالبہ اسی مقصد کے لئے پیش کیا تھا۔

مملکت کے لئے دو بنیادی عناصر لاینفک ہیں ـــــ قوانین اور قوتِ نافذہ۔ جہاں تک قوت کا تعلق ہے اقبالؒ نے اس سلسلہ میں ایسا پیغام دیا ہے جس میں اسلام کی پوری کی پوری غرض و غایت سمٹ کر آجاتی ہے۔ انہوں نے کہا ہے کہ قرآن اور تلوار ایک دوسرے کے ساتھ لازم و ملزوم ہیں۔ تیغ کی اس لئے ضرورت ہے کہ قرآن کے قوانین کو عملاً نافذ کیا جا سکے۔ اور قرآن کی اس لئے کہ وہ تیغ (قوت) کو بے باک نہ ہونے دے۔ اسے حدودِ خداوندی کے اندر رکھ کر استعمال کیا جائے۔ ضربِ کلیم کی وہ مشہور نظم، جس کا عنوان ہی " قوت اور دین " ہے، ان کے اس پیام کی مظہر ہے ؎

اسکندر و چنگیز کے ہاتھوں سے جہاں میں　　سو بار ہوئی حضرتِ انساں کی قبا چاک
تاریخِ امم کا یہ پیامِ ازلی ہے　　صاحب نظراں! نشۂ قوت ہے خطرناک
اس سیلِ سبک سیر و زمیں گیر کے آگے　　عقل و نظر و علم و ہنر ہیں خس و خاشاک
لادیں ہو تو ہے زہرِ ہلاہل سے بھی بڑھ کر
ہو دیں کی حفاظت میں تو ہر زہر کا تریاک　　(ص۲۳)

دوسرے مقام پر اس شمشیر کے متعلق، جو دین کی حفاظت کے لئے استعمال کی جائے، کہتے ہیں کہ :ـ

اُس بیت کا یہ مصرعِ اوّل ہے کہ جس میں　　پوشیدہ چلے آتے ہیں توحید کے اسرار　　(ص۲۱)

ان کے اس مشہور شعر :ـ

جلالِ پادشاہی ہو کہ جمہوری تماشا ہو　　جدا ہو دیں سیاست سے تو رہ جاتی ہے چنگیزی
(بالِ جبریل، ص۶۲)

ہیں، سیاست سے مراد، اقتدارِ مملکت ہے اور دین سے مراد، حدودِ خداوندی یا قرآنی اقدار و اصول۔

لیکن اس قسم کے اشعار کے علاوہ، انہوں نے قرآن اور تیغ کے باہمی رشتے کو جاوید نامہ میں' (محترمہ خاتون).... شرف النساء کی زبان سے' جس حسین اور لطیف انداز میں بیان کیا ہے، اس کی مثال کہیں اور نہیں ملتی۔ انہوں نے لکھا ہے کہ شرف النساء' قرآنِ پاک کی تلاوت کرتیں تو تلوار کو اپنی کمر کے ساتھ پیوست رکھتیں۔ یہ اس کا زندگی بھر کا شعار تھا۔ جب اس کی وفات کا وقت قریب آیا تو ؎

برلبِ او چوں دمِ آخر رسید | سوئے مادر دید و مشتاقانہ دید
گفت اگر از رازِ من داری خبر | سوئے ایں شمشیر و ایں قرآں نگر
ایں دو قوت حافظِ یک دیگر اند | کائناتِ زندگی را محور اند!
وقتِ رخصت با تو دارم ایں سخن | تیغ و قرآں را جدا از من مکن

مومناں را تیغ با قرآں بس است
تربتِ ما را ہمیں ساماں بس است (جاوید نامہ۔ ص ۱۸۲-۸۳)

انہوں نے پیامِ مشرق کے دیباچہ میں، مومن حکمران کے متعلق کہا ہے کہ: ؎

حکمرانے بود و سامانے نداشت | دستِ او جز تیغ و قرآنے نداشت (ص ش)

جاوید نامہ میں انہوں نے ملک مظفر کے قصہ کے ضمن میں کہا ہے کہ ؎

مردِ مومن را عزیز اے نکتہ رس | چیست جز قرآن و شمشیر و فرس؟ (ص ۲۴۰)

میں اسے دہرا دوں کہ قرآن و شمشیر کے باہمی رشتہ کے متعلق یہ کہہ کر کہ " ایں دو قوت حافظِ یک دیگر اند" اسلام کی جامع تفسیر بیان کر دی گئی ہے۔ اسلام اسی کا نام ہے! ۔ تلوار، قرآن کی حفاظت کرے اور قرآن' تلوار کی۔

اور اب ہم سورۂ حدید کی متعلقہ آیت (۵۷/۲۵) کے پہلے حصے کی طرف آتے ہیں۔ یعنی کتاب۔ (ضابطۂ قوانین) ــ

قانون سازی

علامہ اقبالؒ نے جب پاکستان کا تصور پیش کیا تھا تو یہ حقیقت ان کے پیشِ نظر تھی کہ اس مملکت میں سب سے اہم سوال قانون سازی کا ہوگا۔ بظاہر یہ بات بڑی عجیب سی لگتی ہے کہ اسلامی مملکت میں قانون سازی کا مسئلہ اس قدر مشکل ہو! جس اُمت کے پاس خدا کی کتاب اپنی حقیقی اور غیر محرف شکل میں موجود ہو، اس کے لئے اپنی (اسلامی) مملکت میں قوانین مرتب کرنے میں کونسی دشواری پیش آسکتی ہے؟ لیکن جاننے والے جانتے ہیں ـــــ اور پاکستان کی تیس سالہ تاریخ نے اس حقیقت کو واضح کر دیا ہے کہ بحالاتِ موجودہ، اسلامی مملکت کے لئے قانون سازی کا مسئلہ دشوار ترین بلکہ لاینحل ہے۔ یہ اس لئے کہ امت مختلف فرقوں میں بٹی ہوئی ہے اور ہر فرقہ کا ضابطۂ قوانینِ شریعت اپنا اپنا اور الگ الگ ہے، اور کوئی فرقہ، اپنی فقہ کو چھوڑنا تو ایک طرف، اس میں ذرا سے ردّ و بدل کے لئے بھی تیار نہیں۔ دوسری طرف یہ حقیقت بھی واضح اور مسلمہ ہے کہ ایک مملکت اسی صورت میں مملکت بن سکتی اور قائم رہ سکتی ہے جب اس میں ایک ضابطۂ قوانین نافذ ہو جس کا اطلاق تمام افرادِ مملکت پر یکساں ہو۔ سیکولر حکومتوں نے اس کا حل یہ تجویز اور اختیار کیا کہ مختلف فرقوں کو اس کی اجازت

دے دی کہ وہ شخصی معاملات کے لئے اپنی اپنی فقہ پر عمل کریں اور پبلک لاز (مذہب کی دخل اندازی کے بغیر) حکومت خود مرتب کرے۔ لیکن ظاہر ہے کہ اس قسم کے نظام کو کبھی اسلامی نہیں کہا جا سکتا۔ اول اس لئے کہ قرآن کی رو سے، پرسنل لاز اور پبلک لاز میں کسی قسم کی تفریق اور تخصیص نہیں کی جا سکتی۔ اس کے نزدیک انسانی زندگی ایک غیر منقسم وحدت ہے جسے پرائیویٹ اور پبلک سیکٹروں میں تقسیم نہیں کیا جا سکتا۔ دوسرے اس لئے کہ پرائیویٹ سیکٹر ہو یا پبلک، اسلامی حکومت اس کی مجاز ہی نہیں کہ وہ بلا حدود و قیود (عام اصطلاح میں، مذہب کی دخل اندازی کے بغیر) قوانین مرتب کر سکے۔ وہ حدود اللہ کے اندر رہتے ہوئے ہی قوانین مرتب کر سکتی ہے۔

علامہ اقبالؒ نے اس اہم ترین (اور بظاہر مشکل ترین) مسئلہ کا حل یہ بتایا کہ اسلامی مملکت میں قوانین کی بنیاد خدا کی کتاب، قرآن مجید قرار پاتی ہے۔ جو قوانین اس بنیاد پر مرتب ہوں گے ان میں کوئی اختلاف نہیں ہوگا۔ ان میں نہ پرسنل اور پبلک لاز کی تفریق ہوگی، نہ فرقوں کی تخصیص۔ ان کا اطلاق تمام مسلمانوں پر یکساں ہوگا۔ انہوں نے اس سوال پر، تصور پاکستان پیش کرنے کے بعد ہی غور نہیں فرمایا۔ یہ بہت پہلے سے ان کی فکر و تدبر کا مرکز تھا۔ (مثلاً) امرتسر میں اہل قرآن کی ایک جماعت تھی جس کے سربراہ، خواجہ احمد دین (مرحوم) تھے۔ ۱۹۲۵ء کا ذکر ہے کہ صوفی غلام مصطفٰے تبسم نے (جو اب مرحوم ہو چکے ہیں) حضرتِ علامہ کی خدمت میں یہ تجویز پیش کی کہ قرآنی قوانین مرتب کرنے کے سلسلہ میں خواجہ صاحب کے ساتھ تبادلۂ خیالات مفید ہو سکتا ہے! اس کے جواب میں علامہؒ نے صوفی صاحب کو ایک مفصل خط لکھا، جو (تمہید حذف کرنے کے بعد) درج ذیل کیا جاتا ہے۔ فرمایا:-

مجھ کو اُن کے خیالات سے کسی حد تک پہلے بھی آگاہی ہے۔ کیا اچھا ہو کہ وہ شریعتِ محمدؐیہ پر ایک مبسوط کتاب تحریر فرمائیں، جس میں عبادات و معاملات کے متعلق صرف قرآن سے استدلال کیا گیا ہو۔ "معاملات" کے متعلق خاص طور پر اس قسم کی کتاب کی آج کل شدید ضرورت ہے۔ ہندوستان میں تو شاید اس کے مقبول ہونے کے لئے مدت درکار ہے۔ ہاں دوسرے اسلامی ممالک میں اس کی ضرورت کا احساس ہر روز بڑھ رہا ہے۔ شیخ علی رزاق اور دوسرے علمائے مصر کے مباحث سے مولوی صاحب آگاہ ہوں گے۔ علیٰ ہذا القیاس ترکی میں بھی یہی مسائل زیرِ غور ہیں۔ اس پر ایک آدھ کتاب بھی تصنیف ہو چکی ہے، اس میں زیادہ تر زمانہ حال کے مغربی اصولِ فقہ کو ملحوظ رکھ کر فقہ اسلامی پر بحث کی گئی ہے۔ ترکوں نے جو "چرچ" اور "سٹیٹ" میں امتیاز کر کے ان کو الگ الگ کر دیا ہے، اس کے نتائج نہایت دور رس ہیں اور کوئی نہیں کہہ سکتا کہ یہ افتراق اقوامِ اسلامیہ کے لئے باعث برکت ہوگا یا شقاوت۔ غرض کہ مولوی صاحب موصوف یا اُن کے رفقا کو جو کلامِ الٰہی اور مسلمانوں کے دیگر مذہبی لٹریچر پر عبور رکھتے ہیں، اس طرف توجہ کرنی چاہیئے۔ میں اور مجھ ایسے اور لوگ صرف ایک آنکھ رکھتے ہیں۔ ایک مدت سے ہم یہ سُن رہے ہیں کہ قرآن کامل کتاب ہے اور خود اپنے کمال کا مدعی ہے۔ رسالہ "بلاغ" امرتسر کے ہر نمبر میں اور مولوی حشمت علی صاحب کے رسالہ "اشاعت القرآن" کے ہر نمبر میں اسی پر بحث ہوتی ہے۔ لیکن ضرورت اس امر کی ہے کہ اس کے کمال کو عملی طور پر ثابت کیا جائے کہ سیادتِ انسانی کے لئے تمام ضروری قواعد اس میں موجود ہیں اور

اس میں فلاں فلاں آیات سے فلاں فلاں قواعد کا استخراج ہوتا ہے۔ نیز جو جو قواعد عبادات یا معاملات کے متعلق (بالخصوص مؤخر الذکر کے متعلق) دیگر اقوام میں، اس وقت مروج ہیں، اُن پر قرآنی نقطۂ نگاہ سے تنقید کی جائے اور دکھایا جائے کہ "وہ" بالکل ناقص ہیں اور ان پر عمل کرنے سے نوعِ انسانی کبھی سیادت سے بہرہ اندوز نہیں ہو سکتی۔ میرا عقیدہ یہ ہے کہ جو شخص اس وقت قرآنی نقطۂ نگاہ سے زمانۂ حال کے "جورس پروڈنس" پر ایک تنقیدی نگاہ ڈال کر احکامِ قرآنیہ کی ابدیت کو ثابت کریگا، وہی اسلام کا مجدد ہوگا اور بنی نوعِ انسان کا سب سے بڑا خادم بھی وہی شخص ہوگا۔ قریباً تمام ممالک میں اس وقت مسلمان یا تو اپنی آزادی کے لئے لڑ رہے ہیں یا قوانینِ اسلامیہ پر غور و فکر کر رہے ہیں (سوائے ایران و افغانستان کے) مگر ان ممالک میں بھی امروز و فردا یہ سوال پیدا ہونے والا ہے، مگر افسوس ہے کہ زمانۂ حال کے اسلامی فقہا یا تو زمانہ کے میلانِ طبیعت سے بالکل بے خبر ہیں یا قدامت پرستی میں مبتلا ہیں۔ ایران میں مجتہدینِ شیعہ کی تنگ نظری اور قدامت پرستی نے بہاء اللہ کو پیدا کیا جو سرے سے احکامِ قرآنی کا ہی منکر ہے۔ ہندوستان میں عام حنفی اس بات کے قائل ہیں کہ اجتہاد کے تمام دروازے بند ہیں۔ میں نے ایک بہت بڑے عالم کو یہ کہتے سنا کہ حضرت امام ابو حنیفہؒ کا نظیر ناممکن ہے۔ غرض کہ یہ وقت عملی کام کا ہے۔ کیونکہ میری ناقص رائے میں مذہبِ اسلام اس وقت گویا زمانے کی کسوٹی پر کسا جا رہا ہے اور شاید تاریخِ اسلام میں ایسا وقت اس سے پہلے کبھی نہیں آیا۔

(اقبالؒ نامہ - حصہ اول - ص ۵۱ - ۴۸)

اس خط میں، علاوہ دیگر امور، یہ الفاظ کہ "جس میں صرف قرآن سے استدلال کیا گیا ہو" حضرت علامہؒ کے مرکزی فکر کی بین شہادت پیش کرتے ہیں۔ وہ قرآنِ خالص کو قانون سازی کی اساس قرار دیتے تھے۔ محترم محمد حسین عرشی صاحب نے علامہ سے اپنی ایک ملاقات کے سلسلہ میں کہا ہے:-

میں نے پوچھا: اسلام بتمامہ قرآن میں محصور ہے یا نہیں؟ فرمایا: "مفصل کہو"۔ میں نے کہا: خارج از قرآن ذخیرہ، احادیث و روایات اور کتب فقہ وغیرہ کو شامل کر کے اسلام مکمل ہوتا ہے یا صرف قرآن اس باب میں کفایت کرتا ہے؟ آپ نے فرمایا: یہ چیزیں تاریخ و معاملات پر مشتمل ہیں۔ ان کی بھی ضرورت ہے۔ ان سے پتہ چلتا ہے کہ یہ کن ضروریات کے ماتحت وضع کی گئیں۔ لیکن نفسِ اسلام قرآن مجید میں بکمال و تمام آ چکا ہے۔ خدائے تعالےٰ کا منشا دریافت کرنے کے لئے ہمیں قرآن سے باہر جانے کی ضرورت نہیں[1]۔

(ملفوظات - مرتبہ محمود نظامی - ص ۴۶ - ۴۵)

اسی طرح ایک اور نشست میں، گفتگو کے سلسلہ میں (عرشی صاحب نے) فرمایا ہے کہ ایک صاحب نے آمدِ حضرت مسیحؑ کے ضمن میں حضرت علامہ سے کہا کہ آپ لکھ دیجئے کہ آپ حدیث شریف کے مطابق مسیحؑ کی آمدِ ثانی پر اعتقاد رکھتے ہیں۔ علامہ نے فرمایا۔ "میرا یہ اعتقاد نہیں ہے"۔ انہوں نے کہا: "کیا آپ کو حدیث کی صحت سے انکار ہے"؟

---

[1] واضح رہے کہ یہ سنہ ۱۹۳۵ء کی بات ہے۔

آپ نے فرمایا: "میں اعتقادی امور میں صرف قرآن پر انحصار رکھتا ہوں اور حدیث کے متعلق مجھے اور آپ سب کو معلوم ہے کہ (ریکن) ذریعوں سے ہم تک پہنچی ہے"۔ (ملفوظات۔ صـ ۵۲-۵۱)

اسی طرح انہوں نے سید سلیمان ندوی (مرحوم) کے نام اپنے ایک خط میں لکھا ہے کہ "مجھے اس سے انکار ہے کہ حدیث قرآن کی ناسخ ہو سکتی ہے"۔ (اقبال نامہ۔ جلد اوّل۔ صـ ۱۳۵)

اس قسم کی تصریحات، حضرت علامہ کے مکتوبات اور ملفوظات میں جستہ جستہ مقامات پر بکثرت ملتی ہیں۔ لیکن انہوں نے قانون سازی کے موضوع پر، خطباتِ تشکیلِ جدید کے چھٹے خطبہ میں تفصیل کے ساتھ لکھا ہے۔ چونکہ یہ موضوع بڑا اہم اور بنیادی ہے اس لئے میں چاہتا ہوں کہ یہ بحث بکمال و تمام آپ حضرات کے سامنے آ جائے۔ بنا بریں، میں اس خطبہ کے متعلقہ مقامات تفصیلاً پیش کر دینا ضروری سمجھتا ہوں۔

جیسا کہ میں پہلے عرض کر چکا ہوں، قرآنِ کریم نے انسانی زندگی سے متعلق اصول و اقدار عطا کئے ہیں اور اسے امتِ مسلمہ پر چھوڑا ہے کہ وہ اپنے اپنے زمانے کے تقاضوں کے مطابق ان اصولوں کی جزئیات اور ان پر عمل پیرا ہونے کے طور طریق، باہمی مشاورت سے خود مرتب کرے۔ حضرت علامہؒ اس باب میں تحریر فرماتے ہیں:-

> اسلام کا پیش کردہ تصوّر یہ ہے کہ حیاتِ کلی کی روحانی اساس، ازلی اور ابدی ہے لیکن اس کی نمود تغیر و تنوع کے پیکروں میں ہوتی ہے۔ جو معاشرہ حقیقتِ مطلقہ کے متعلق اس قسم کے تصوّر پر متشکل ہو، اس کے لئے ضروری ہوگا کہ وہ اپنی زندگی میں مستقل اور تغیر پذیر (جیسے متضاد عناصر) میں تطابق و توافق پیدا کرے۔ اس کے لئے ضروری ہے کہ اس کے پاس، اپنی اجتماعی زندگی کے نظم و ضبط کے لئے مستقل اور

ثبات و تغیّر کا امتزاج

> ابدی اصول ہوں۔ اس لئے کہ اس دنیا میں جہاں تغیر کا دَور دَورہ ہے ابدی اصول ہی وہ محکم سہارا بن سکتے ہیں جن پر انسان اپنا پاؤں ٹکا سکے۔ لیکن اگر ابدی اصولوں کے متعلق یہ سمجھ لیا جائے کہ ان کے دائرہ میں تغیر کا امکان ہی نہیں — وہ تغیر جسے قرآن نے عظیم آیات اللہ میں شمار کیا ہے —— تو اس سے زندگی' جو اپنی فطرت میں متحرک واقع ہوئی ہے، یکسر جامد و متصلب بن کر رہ جائے گی۔ یورپ کو عمرانی اور سیاسی علوم میں جو ناکامی ہوئی ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کے ہاں کوئی ابدی اور غیر متبدل اصولِ حیات نہیں تھے۔ اس کے برعکس، گذشتہ پانچ سو سال میں اسلام جس قدر جامد اور غیر متحرک بن کر رہ گیا ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ مسلمانوں نے مستقل اقدار کے دائرے میں اصولِ تغیّر کو نظر انداز کر رکھا ہے۔ لہٰذا دیکھنے کی چیز یہ ہے کہ اسلام کی وضع اور ترکیب میں کونسا اصولِ حرکت کارفرما ہے؛ یہ وہی اصول ہے جسے اجتہاد کہتے ہیں۔

اس کے بعد وہ اس خطبہ میں مسئلہ اجتہاد پر بڑی تفصیل سے گفتگو کرتے ہیں۔ وہ اجتہادِ مطلق کو اسلام کا بنیادی اصول قرار دیتے ہیں۔ یعنی قرآنی حدود کے اندر رہتے ہوئے قانون سازی کا کُلی اختیار۔ وہ اس اجتہاد کے متعلق بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں:-

> سُنّی حضرات، نظری طور پر تو اس کے قائل ہیں کہ اس قسم کا اجتہاد ممکن ہے۔ لیکن ائمہ فقہ کے

مذاہب کے قیام کے بعد عملاً اس کا دروازہ بند ہے۔ اس لئے کہ اس قسم کے اجتہاد کے لئے جن شرائط کو ضروری قرار دیا جاتا ہے، ان کا پورا کرنا کسی ایک فرد کے لئے قریب قریب ناممکن ہے۔ ایک ایسے نظامِ شریعت میں، جس کی بنیاد قرآن پر ہو جو زندگی کے متعلق حرکیاتی اور ارتقائی تصوّر کا علمبردار ہے، اس قسم کی ذہنیت کچھ عجیب سی دکھائی دیتی ہے۔ لہٰذا آگے بڑھنے سے پیشتر یہ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ ہم ان اسباب و علل کا انکشاف کریں جن کی وجہ سے یہ ذہنیت پیدا ہوئی جس نے قانونِ شریعت کو یکسر منجمد بنا کر رکھ دیا۔

میں اس وقت ان اسباب و علل کی تفصیل میں نہیں جانا چاہتا جنہیں علامہ اقبالؒ نے اس جمود و تعطّل کا ذمہ دار گردانا ہے۔ میں ان میں سے دو ایک اہم نکات پر اکتفا کروں گا۔ وہ (اپنے اس خطبہ میں) لکھتے ہیں:۔

قانون سازی کے لئے قرآنی اصول

آیئے اب ایک نظر ان اصولوں پر ڈالیں جو قرآن نے قانون سازی کے سلسلہ میں دیئے ہیں۔

ان پر غور کرنے سے یہ حقیقت واضح ہو جائے گی کہ ان اصولوں کی رُو سے یہ قطعاً نہیں ہوتا کہ انسانی فکر سلب ہو جائے اور قانون سازی کے لئے کوئی میدان ہی نہ رہے۔ اس کے برعکس ان اصولوں میں جس قدر وسعت رکھی گئی ہے اس سے انسانی فکر بیدار ہوتی ہے۔ یہی وہ اصول تھے جن کی راہ نمائی سے ہمارے قدیم فقہا نے، قانونِ شرعی کے متعدد نظام (سسٹم) مرتب کئے۔ اور تاریخ اسلام کا طالب علم اس حقیقت سے واقف ہے کہ سیاسی اور معاشرتی نظامِ زندگی کی حیثیت سے اسلام کو جو اس قدر کامیابی حاصل ہوئی تو اس کا کم از کم آدھا حصہ انہی فقہا کی بالغ نظری کا رہینِ منت تھا۔ چنانچہ فان کریمر اس ضمن میں لکھتا ہے کہ:۔

> رومیوں کو چھوڑ کر دنیا میں سوائے عربوں کے اور کوئی قوم ایسی نہیں
> جس کے پاس اس قدر احتیاط سے مرتب کردہ قانونی نظام ہو۔

لیکن اس تمام ہمہ گیری کے باوجود، یہ قانونی ضوابط بالآخر انفرادی تعبیرات کا مجموعہ ہیں۔ اس لئے انہیں حتمی اور قطعی سمجھ لینا غلط ہے۔ مجھے اس کا علم ہے کہ علمائے اسلام کا یہ عقیدہ ہے کہ ہمارے مشہور مذاہبِ (اربعہ) اپنی اپنی جگہ مکمل اور مختتم ہیں۔ لیکن نظری طور پر اجتہادِ مطلق کے امکان سے انہیں بھی کبھی انکار نہیں ہوا۔ میں نے (پچھلے صفحات میں) ان اسباب و علل سے بحث کی ہے جو علماء کی اس ذہنیت کا موجب بنے۔ لیکن چونکہ اب حالات بدل چکے ہیں، اور دنیائے اسلام ان تمام نئی نئی قوتوں سے دوچار اور متاثر ہے جو زندگی کے مختلف گوشوں میں فکرِ انسانی کی نشو و ارتقاء سے وجود میں ...... آ گئی ہیں، اس لئے مجھے کوئی وجہ نظر نہیں آتی کہ اس قدامت پرستانہ ذہنیت کو باقی رکھا جائے۔ میں پوچھتا ہوں کہ کیا ان مذاہبِ فقہ کے بانیوں میں سے کسی نے بھی اپنی تعبیرات و تاویلات کو کبھی قطعی، کامل، مختتم اور سہو و خطا سے مبرّا سمجھا؟ کبھی نہیں۔ اس لئے اگر دورِ حاضر کے اعتدال پسند مسلمان، زمانے کے بدلے ہوئے حالات اور اپنے تجربہ کی روشنی میں، فقہ کے اصولِ اساسی

کی نئی تعبیرات کرنا چاہتے ہیں تو ان کا یہ طرزِ عمل میرے خیال میں بالکل بجا اور درست ہے۔ خود قرآن کی یہ تعلیم کہ حیات، ایک ترقی پذیر عمل ارتقاء ہے۔ اس کی مقتضی ہے کہ ہر نئی نسل کو اس کا حق ہونا چاہیئے کہ وہ اپنی مشکلات کا حل خود تلاش کرے۔ وہ ایسا کرنے میں سلف کے علمی سرمایہ سے راہ نمائی لے سکتے ہیں لیکن اسلاف کے فیصلے اِن کے راستے میں روک نہیں بن سکتے۔

وہ اس قسم کی ماضی پرستی کو تاریخ کا جھوٹا احترام قرار دیتے ہیں۔ اس ضمن میں وہ کہتے ہیں کہ:-

قوموں کے زوال کا علاج ان کے ماضی کی تاریخ کے جھوٹے احترام اور اس کے مصنوعی احیاء سے نہیں ہو سکتا، جیسا کہ دورِ حاضر کے ایک مصنف نے لکھا کہ:-

تاریخ کا فیصلہ یہ ہے کہ وہ خیالات اور نظریات جو اپنی توانائی کھو کر فرسودہ ہو چکے ہوں، ان لوگوں میں کبھی پھر سے توانائی حاصل نہیں کر سکتے جنہوں نے انہیں فرسودہ بنا دیا ہو۔

تیرھویں صدی اور اس کے بعد کے علماء کا یہ رجحان کہ ماضی کی جھوٹی تقدیس سے جماعتی نظم کو جامد اور متصلب طور پر قائم رکھا جائے، اسلام کی روح کے یکسر خلاف تھا۔

اور اس نکتہ کی تشریح کرتے ہوئے کہتے ہیں:-

اسلام میں اجتہاد کا دروازہ بند کر دینا، اسلام کے خلاف افترٰی ہے۔ اس کی ایک وجہ تو یہ ہوئی کہ مسلمانوں میں قانون کے تصوّر نے ایک خاص معین شکل اختیار کر لی۔ اور ایک وجہ یہ کہ قوموں کے زوال کے زمانہ میں ذہنوں میں اس قدر جمود اور تساہل پیدا ہو جاتا ہے کہ بڑے بڑے مفکرین کو (انسان سمجھنے کے بجائے) معبود بنا دیا جاتا ہے۔ اگر علمائے متاخرین میں سے بھی بعض نے اس "افتراء" کو برقرار رکھا ہے تو وہ ان کا اپنا فعل ہے۔ دورِ حاضر کا مسلمان اس کا پابند نہیں کہ جس طرح انہوں نے برضا و رغبت اپنی فکری آزادی کو (اپنے خود ساختہ معبودوں کی) نذر کر دیا تھا یہ بھی اپنی آزادی کو سلب ہو جانے دیں۔ علامہ سرخسیؒ (دسویں صدی میں) لکھتے ہیں:-

اگر اس افتراء کے حامی یہ سمجھتے ہیں کہ پہلے زمانے کے مفکرین و مصنفین کو زیادہ سہولتیں حاصل تھیں اور ان کے مقابلہ میں متاخرین کے راستے میں بہت سی دشواریاں ہیں، تو ایسا سمجھنا سراسر حماقت ہے۔ اس لئے کہ اس معمولی سی بات کے سمجھنے کے لئے کسی افلاطون کی عقل کی ضرورت نہیں کہ متقدمین کے مقابلہ میں متاخرین کے لئے اجتہاد زیادہ آسان ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اب قرآن اور سنت کی اس قدر تفسیریں اور شرحیں لکھی جا چکی ہیں کہ ہمارے زمانے کے مجتہد کے پاس، تعبیرات کے لئے کافی سے زیادہ مسالہ موجود ہے (جو متقدمین کے پاس نہیں تھا)۔

ان تصریحات سے واضح ہے کہ علّامہ اقبالؒ کے نزدیک، مروجہ فقہ (خواہ وہ کسی فرقہ کی فقہ ہو) ناقابلِ تغیر نہیں۔

اس میں قرآن کی روشنی میں، موجودہ زمانے کے تقاضوں کے مطابق، تبدیلیاں ازبس ضروری اور ناگزیر ہیں۔ لیکن ایسا کہتے وقت وہ اس حقیقت سے بھی بے خبر نہیں تھے کہ:-

> بدقسمتی سے ہمارے ہاں کا قدامت پرست طبقہ فقہ کے متعلق کسی ناقدانہ گفتگو کے لئے تیار نہیں۔ اگر اس قسم کی بحث چھیڑی جائے تو بہت سے لوگوں کے لئے ناگواری کا باعث ہو جائے گی۔

لیکن انہوں نے کہا کہ:-

> با ایں ہمہ، میں مسئلہ زیرِ نظر کے متعلق چند معروضات پیش کرنے کی جسارت ضرور کروں گا۔ سب سے پہلے ہمیں اس حقیقت کو پیشِ نظر رکھنا چاہیئے کہ قرنِ اوّل سے لے کر عباسیوں کے زمانے کے آغاز تک مسلمانوں میں قرآن کے سوا کوئی تحریری قانون موجود نہیں تھا۔

علامہ اقبالؒ کی یہی جسارت تھی جس کی وجہ سے وہ اربابِ دانش کی نگاہوں میں اس قدر واجب التکریم و تحریم بن گئے تھے۔ خود انہی کے الفاظ میں:-

آئینِ جواں مرداں، حق گوئی و بیباکی — اللہ کے شیروں کو آتی نہیں روباہی

یہاں تک بحث فقہ کے متعلق تھی۔ لیکن اس سے کہیں نازک مقام وہ ہے جہاں احادیث کا سوال سامنے آتا ہے۔ فقہ کی نسبت تو پھر بھی غیر از انبیاءؑ حضرات کی طرف ہوتی ہے، لیکن جب بات ان ارشادات و اعمال کے متعلق ہو جن کی نسبت رسول اللہؐ کی طرف کی جائے، تو ان کی بابت یہ کہنا کہ اسلامی مملکت ان میں بھی تبدیلی کر سکتی ہے، بہت بڑی جرأت کا متقاضی ہے۔ مبداءِ فیض کی یہ انتہائی کرم گستری تھی کہ اس نے علامہؒ اقبال کو اس قسم کی جرأت و بسالت سے بھی نوازا تھا۔ چنانچہ انہوں نے اس سوال پر بھی (اپنے خطبہ میں) بڑی تفصیلی گفتگو کی ہے۔ اس باب میں وہ لکھتے ہیں:-

احادیث کی قانونی حیثیت

> احادیث کی دو قسمیں ہیں۔ ایک وہ جن کی حیثیت قانونی ہے اور دوسری وہ جو قانونی حیثیت نہیں رکھتیں۔ اوّل الذکر کے بارے میں ایک بڑا اہم سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ وہ کس حد تک ان رسوم و رواج پر مشتمل ہیں جو اسلام سے پہلے عرب میں رائج تھے اور جن میں سے بعض کو رسول اللہ صلعم نے علیٰ حالہٖ رکھا اور بعض میں ترمیم فرما دی۔ آج یہ مشکل ہے کہ ان چیزوں کو پورے طور پر معلوم کیا جا سکے کیونکہ ہمارے متقدمین نے اپنی تصانیف میں زمانۂ قبل از اسلام کے رسوم و رواج کا زیادہ ذکر نہیں کیا۔ نہ ہی یہ معلوم کرنا ممکن ہے کہ جن رسوم و رواج کو رسول اللہؐ نے علیٰ حالہٖ رکھا (خواہ ان کے لئے واضح طور پر حکم دیا ہو یا ویسے ہی ان کا استصواب فرما دیا ہو)۔ انہیں ہمیشہ کے لئے نافذ العمل رکھنا مقصود تھا۔ اس موضوع پر شاہ ولی اللہؒ نے بڑی عمدہ بحث کی ہے جس کا خلاصہ میں یہاں بیان کرتا ہوں۔ شاہ صاحبؒ نے کہا ہے کہ پیغمبرانہ طریقِ تعلیم یہ ہوتا ہے کہ رسول اللہؐ کے احکام ان لوگوں کے عادات و اطوار اور رسوم و رواج کو خاص طور پر ملحوظ رکھتے ہیں جو اس کے اوّلین مخاطب

ہوتے ہیں۔ پیغمبر کی تعلیم کا مقصد یہی ہوتا ہے کہ وہ عالمگیر اصول عطا کر دے لیکن نہ تو مختلف قوموں کے لئے مختلف اصول دیئے جا سکتے ہیں اور نہ ہی انہیں بغیر کسی اصول کے چھوڑا جا سکتا ہے کہ وہ اپنے مسلکِ زندگی کے لئے جس قسم کے اصول چاہیں وضع کر لیں۔ لہٰذا پیغمبر کا طریق یہ ہوتا ہے کہ وہ ایک خاص قوم کو تیار کرتا ہے اور انہیں ایک عالمگیر شریعت کے لئے بطور خمیر استعمال کرتا ہے۔ اس مقصد کے لئے وہ ان اصولوں پر زور دیتا ہے جو تمام نوعِ انسانی کی معاشرتی زندگی کو اپنے سامنے رکھتے ہیں۔ لیکن ان اصولوں کا نفاذ اس قوم کے عادات و خصائل کی روشنی میں کرتا ہے جو اس وقت اس کے سامنے ہوتی ہے۔ اس طریقِ کار کی رُو سے رسول کے احکام' اس قوم کے لئے خاص ہوتے ہیں اور چونکہ ان احکام کی ادائیگی بجائے خویش مقصود بالذات نہیں ہوتی، انہیں آنے والی نسلوں پر من وعن نافذ نہیں کیا جا سکتا۔ غالباً یہی وجہ تھی کہ امامِ اعظم ابوحنیفہؒ نے (جو اسلام کی عالمگیریت کی خاص بصیرت رکھتے تھے) اپنی فقہ کی تدوین میں حدیثوں سے کام نہیں لیا۔ انہوں نے تدوینِ فقہ میں استحسان کا اصول وضع کیا جس کا مفہوم یہ ہے کہ قانون وضع کرتے ہوئے اپنے زمانے کے تقاضوں کو سامنے رکھنا چاہیئے۔ اس سے احادیث کے متعلق ان کے نقطۂ نظر کی وضاحت ہو جاتی ہے۔ یہ کہا جاتا ہے کہ امام ابوحنیفہؒ نے تدوینِ فقہ میں احادیث سے اس لئے کام نہیں لیا کہ ان کے زمانہ میں احادیث کے کوئی باضابطہ مجموعے مرتب نہیں ہوئے تھے۔ اوّل تو یہ کہنا ہی درست نہیں کہ ان کے زمانے میں احادیث کے مجموعے موجود نہیں تھے۔ امام مالکؒ اور زہری کے مجموعے ان کی وفات سے قریب تیس سال پہلے مرتب ہو چکے تھے۔ لیکن اگر یہ فرض بھی کر لیا جائے کہ یہ مجموعے امام صاحبؒ تک پہنچ نہیں پائے تھے یا ان میں قانونی حیثیت کی احادیث موجود نہیں تھیں، تو اگر امام صاحبؒ اس کی ضرورت سمجھتے تو وہ احادیث کا اپنا مجموعہ مرتب فرما سکتے تھے، جیسا کہ امام مالکؒ اور ان کے بعد امام احمد بن حنبلؒ نے کیا تھا۔ ان حالات کی روشنی میں، میں بھی یہ سمجھتا ہوں کہ ان احادیث کے متعلق جن کی حیثیت قانونی ہے، امام ابوحنیفہؒ کا یہ طرزِ عمل بالکل معقول اور مناسب تھا اور اگر آج کوئی وسیع النظر مقنن یہ کہتا ہے کہ احادیث ہمارے لئے من وعن شریعت کے احکام نہیں بن سکتیں تو اس کا یہ طرزِ عمل امام ابوحنیفہؒ کے طرزِ عمل کے ہم آہنگ ہو گا، جن کا شمار فقہ اسلامی کے بلند ترین مصنفین میں ہوتا ہے۔

احادیث کے متعلق امام ابوحنیفہؒ کا یہ طرزِ عمل اور علامہ اقبالؒ کی طرف سے اس کی تائید، قرآن کریم کی تعلیم کے عین مطابق تھی۔ دین کے اصول حضورؐ نبی اکرم کو خدا کی طرف سے بذریعۂ وحی عطا ہوئے تھے۔ ان میں کسی قسم کے تغیر و تبدل کا سوال پیدا نہیں ہوتا تھا۔ لیکن دین کے ان اصولوں پر عمل پیرا ہونے کے طور طریقے، بذریعۂ وحی متعین نہیں ہوئے تھے۔ ان کے متعلق حضورؐ کو حکمِ خداوندی تھا کہ:۔

شَاوِرۡهُمۡ فِي الۡاَمۡرِ۔ (۳/۱۵۷) ان کا تعین اپنے رفقاء کے ساتھ مشورہ سے کیا کرو۔

اب ظاہر ہے کہ جو امور باہمی مشاورت سے طے ہوں، وہ وحی کی طرح ابدی اور غیر متبدل نہیں ہو سکتے۔ حضورؐ نے بھی ان جزئیات کو صحابہؓ کے ساتھ مشورہ سے طے فرمایا۔ اور حضورؐ کے بعد جماعتِ مومنین کے متعلق بھی کہا گیا کہ:۔

وَاَمْرُهُمْ شُوْرٰى بَيْنَهُمْ۔ (۴۲/۳۸) یہ اپنے معاملات باہمی مشاورت سے طے کریں گے۔
یہ طریقِ عمل دورِ خلافتِ راشدہ میں جاری رہا۔ اُس وقت تک یہ بات کسی کے حیطۂ خیال میں بھی نہیں تھی کہ یہ فیصلے ابدی طور پر غیر متبدل رکھے جائیں گے۔ یہ تصوّر خلافتِ راشدہ کے باقی نہ رہنے کے بعد پیدا ہوا۔

احادیثِ رسول اللہ (اور ان کے مطابق صحابہؓ کے عمل) کو ابدی طور پر غیر متبدل قرار دینے کا تصوّر امام مالکؒ اور ان سے کہیں بڑھ کر امام شافعیؒ نے پیش کیا تھا ——— اس مسلک پر امام ابوحنیفہؒ نے کڑی تنقید کی۔ اور قیاس کو قانون کا ماخذ قرار دیا۔ قیاس سے مراد ہے کسی حکم یا فیصلہ کو عقل و بصیرت کی رُو سے اس سے ملتے جلتے حالات پر منطبق کرنا ——— علامہ اقبالؒ ان کی اس نزاع پر گفتگو کرتے ہوئے امام مالکؒ اور امام شافعیؒ کے متعلق لکھتے ہیں :۔

انہوں نے اپنے آپ کو صرف ان نظائر کے دائرہ میں محدود کر لیا جو عہدِ رسالتمآبؐ اور عہدِ صحابہؓ میں وقوع میں آئے تھے۔ اس سے ان کی نگاہ کا دائرہ بہت تنگ ہو کر رہ گیا۔ انہوں نے بات تو یہاں سے شروع کی تھی کہ اہمیت ٹھوس واقعات کو حاصل ہے۔ لیکن انہوں نے (ایک خاص دور کے) ٹھوس واقعات کو ابدی اور غیر متبدل سمجھ لیا، اور خاص واقعات سے متعلق احکام کو اس قسم کے ملتے جلتے واقعات پر منطبق کرنے کے لئے قیاس سے شاذ و نادر کام لیا۔ ان کے برعکس، ان کی سخت تنقیدیں مذہبِ حنفیہ کے لئے (ایک اور رنگ میں) بڑی مفید ثابت ہوئیں۔ اس سے انہوں نے محسوس کر لیا کہ اصولِ قانون سازی کی تعبیر میں، زندگی کی حقیقی (واقعاتی) نقل و حرکت اور تنوع کو نظر انداز نہیں کرنا چاہیئے۔ یہی وجہ ہے کہ امام ابوحنیفہؒ کا مکتبِ فقہ، جس نے ان مباحث کے نتائج کو اچھی طرح جذب کر لیا تھا، اپنے خاص الخاص اصولِ فقہ میں بالکل آزاد ہے اور دیگر مذاہبِ فقہ و تشریح کے مقابلہ میں، حالات سے مطابقت کی بڑی صلاحیت اپنے اندر رکھتا ہے۔

اور اس کے بعد وہ کہتے ہیں :۔

لیکن جائے حیرت ہے کہ موجودہ حنفی علماء نے، خود اپنے مکتبِ فقہ کی روح کے خلاف، امام ابوحنیفہؒ اور ان کے رفقاء کے فیصلوں کو ابدی اور غیر متبدل قرار دے رکھا ہے، بعینہٖ اسی طرح جس طرح امام ابوحنیفہؒ پر تنقید کرنے والوں نے ان فیصلوں کو ابدی اور غیر متبدل قرار دے لیا تھا جو عہدِ رسالتمآبؐ اور صحابہؓ میں پیش آمدہ مقدمات کے سلسلہ میں نافذ ہوئے تھے۔

ان تصریحات سے ——— یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ علامہ اقبالؒ کے نزدیک اسلامی مملکت میں قانون سازی کا بنیادی اصول یہ تھا کہ ابدی اور غیر متبدل قرآنی احکام و اصول و حدود ہیں۔ ان حدود کے اندر جو فیصلے ماضی میں کئے گئے تھے، یا جو بعد کی اسلامی مملکت کرے، ان میں تغیر و تبدّل کیا جا سکتا ہے۔ لیکن انہیں اس کا بھی بخوبی احساس تھا کہ ایسا کرنے کے لئے بڑی جرأت و بسالت کی ضرورت ہو گی۔ اس باب میں وہ کہتے ہیں کہ :۔

وہ سب سے بڑا سوال جو اس وقت اس کے (ترکی کے) اور جو زود یا بدیر دیگر مسلم اقوام کے سامنے

آنے والا ہے، یہ ہے کہ اسلامی قوانین شریعت میں ارتقاء کی گنجائش ہے یا نہیں؟ یہ سوال بڑا اہم ہے

رُوحِ عمریؓ

اور بہت بڑی ذہنی جدوجہد کا متقاضی۔ اس سوال کا جواب یقیناً اثبات (ہاں) میں ہونا چاہیئے بشرطیکہ اسلامی دنیا اس کی طرف عمرؓ کی روح کو لے کر آگے بڑھے۔
وہ عمرؓ جو اسلام کا سب سے پہلا تنقیدی اور حریت پسند قلب ہے۔ وہ جسے رسول اللہؐ کی حیاتِ طیبہ کے آخری لمحات میں یہ کہنے کی جرأت نصیب ہوئی کہ:-

حسبنا کتاب اللہ

ہمارے لئے خدا کی کتاب کافی ہے

وہ اپنے اس خطبہ کا خاتمہ ان الفاظ پر کرتے ہیں:-

> اسلام کا بنیادی تخیل یہ ہے کہ اب وحی کا دروازہ بند ہو چکا ہے۔ اس بنا پر ہمیں دنیا کی سب سے زیادہ آزاد قوم ہونا چاہیئے۔ پہلے زمانے کے مسلمان جو ایشیائے قبل از اسلام کی روحانی غلامی سے (نئے نئے) آزاد ہوئے تھے، اس پوزیشن میں نہیں تھے کہ (ختمِ نبوّت کے) اس بنیادی تخیل کی اہمیت کا صحیح صحیح اندازہ کر سکتے۔ لیکن دورِ حاضر کے مسلمان کو چاہیئے کہ وہ اپنی پوزیشن کو اچھی طرح سے سمجھے۔ (قرآن کے) غیر متبدل اصولوں کی روشنی میں اپنے معاشرہ کی تشکیل جدید کرے اور وہ عالمگیر جمہوریت قائم کر کے دکھا دے جو اسلام کی اصل و غایت ہے لیکن جو ابھی تک پورے طور پر بے نقاب ہو کر دنیا کے سامنے نہیں آئی۔

یہ ۱۹۲۸ء کی بات تھی۔ انہوں نے ۱۹۳۲ء میں اپنے ایک بیان میں، جو روزنامہ انقلاب (لاہور) کی ۲۳ر مارچ کی اشاعت میں شائع ہوا تھا، فرمایا:-

> تمہارے دین کی یہ عظیم الشان بلند نظری، ملّاؤں اور فقیہوں کے فرسودہ اوہام میں جکڑی ہوئی ہے اور آزادی چاہتی ہے۔ روحانی اعتبار سے ہم حالات و جذبات کے ایک قید خانے میں محبوس ہیں جو صدیوں کی مدت میں ہم نے اپنے گرد خود تعمیر کر لیا ہے، اور ہم بوڑھوں کے لئے شرم کا مقام ہے کہ ہم نوجوانوں کو ان کی اقتصادی، سیاسی، بلکہ مذہبی بحرانوں کا مقابلہ کرنے کے قابل نہ بنا سکے جو زمانۂ حاضر میں آنے والے ہیں۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ ساری قوم کی موجودہ ذہنیت کو یکسر تبدیل کر دیا جائے تاکہ وہ پھر نئی آرزؤں، نئی تمناؤں اور نئے نصب العین کی امنگ کو محسوس کرنے لگے۔
>
> (بحوالہ ماہنامہ فکر و نظر بابت جنوری. فروری ۱۹۷۸ء)

میں سمجھتا ہوں کہ اس باب میں کچھ اور کہنے کی ضرورت نہیں۔ اگر تشکیلِ پاکستان کے بعد حضرت علامہؒ ہم میں موجود ہوتے تو وہ انہی اصولوں کے مطابق مملکتِ اسلامیہ پاکستانیہ کے لئے آئین و ضوابط مرتب کر دیتے یا کرا دیتے اور وہ ضابطہ پھر مسلمانوں کی ہر اس مملکت کے لئے جو حقیقی معنوں میں "اسلامی" بننا چاہتی، خضرِ راہ ثابت ہوتا۔ اس طرح یہ اُمت ان جکڑ بندیوں سے، آزادی حاصل کر لیتی جن میں یہ صدیوں سے محبوس چلی آ رہی ہے۔

اب میں ایک اعتراض کی طرف آرہا ہوں۔ ظاہر ہے کہ علامہ اقبالؒ نے پاکستان کا تصوّر اس لئے دیا تھا کہ اس وقت مسلمانوں کی کسی مملکت میں قرآنی نظام رائج نہیں تھا اور وہ چاہتے تھے کہ ایک ایسا خطۂ زمین حاصل کیا جائے جسے قرآنی نظام کی تجربہ گاہ بنایا جائے۔ جب اس خطۂ زمین میں قرآنی نظام برگ و بار لائے گا تو اس کے قابلِ صد رشک و موجبِ ہزار افتخار نتائج کو دیکھ کر مسلمانوں کی دیگر مملکتیں بھی اس نظام کو اپنے ہاں رائج کرنے پر آمادہ ہو جائیں گی۔ اور اس کے بعد اس کا بھی امکان ہے کہ اس نظام کے انسانیت ساز اثمار کو دیکھ کر غیر مسلم ممالک بھی اس کی طرف کھنچے چلے آئیں۔ یہ تھی علامہ اقبالؒ کی آرزو، اور مطالبۂ پاکستان کا جذبۂ محرکہ۔ لیکن اس تیس سال کے عرصہ میں، نہ تو پاکستان میں قرآنی نظام رائج ہوا اور نہ ہی مسلمانوں کی کسی اور مملکت نے اس کی طرف توجہ کی۔ اس سے معترضین یہ نتیجہ اخذ کرتے ہیں کہ حضرتِ علامہ کی یہ آرزو محض شاعرانہ تخیل پر مبنی تھی۔ قرآن میں کسی زمانہ میں تو اس کی صلاحیت تھی کہ اس کی بنیادوں پر ایک قابلِ عمل نظامِ مملکت وجود میں آ جاتا لیکن اب وہ زمانہ لد گیا۔ اب اس میں اس کی صلاحیت نہیں رہی۔ میں نے اس قسم کے اعتراضات کا تفصیلی جواب اپنے اس خطاب میں دیا ہے جس کا عنوان ہے ——— "کیا اسلام ایک چلا ہوا کارتوس ہے"؟ ——— اس مقام پر میں صرف حضرت علامہؒ کی تصریحات پیش کرنے پر اکتفا کروں گا۔

کیا یہ ممکن العمل بھی ہے؟

جیسا کہ پہلے بتایا جا چکا ہے، قرآن، سلسلۂ رشد و ہدایتِ خداوندی کی آخری کڑی ہے جس میں تمام نوعِ انسان کے لئے ابدی حقائق محفوظ کر دیئے گئے ہیں۔ "تمام نوعِ انسان کے لئے" اور "ابدی طور پر" کے معنی یہ ہیں کہ قرآنی راہ نمائی نہ کسی خاص قوم کے لئے مختص ہے اور نہ ہی کسی خاص زمانے تک محدود۔ اللہ تعالیٰ نے اسے ذِكْرٌ لِّلْعَالَمِينَ (۳۸/۸۷) کہا ہے۔ یعنی تمام اقوامِ عالم کے لئے ضابطۂ ہدایت۔ دوسرے مقام پر اس کی تشریح ان الفاظ سے کر دی کہ "اس کی مثال ایک ایسے درخت کی ہے۔ اَصْلُهَا ثَابِتٌ وَّفَرْعُهَا فِي السَّمَاۤءِ۔ جس کی جڑیں پاتال میں ہوں اور شاخیں آسمان کو چھو رہی ہوں۔ تُؤْتِيْٓ اُكُلَهَا كُلَّ حِيْنٍۢ بِاِذْنِ رَبِّهَا (۱۴/۲۴-۲۵) اور وہ قانونِ خداوندی کے مطابق، ہر زمانے میں اپنے پھل دیتا جائے" حضرت علامہؒ کے الفاظ میں:

یہ نغمہ فصلِ گل و لالہ کا نہیں پابند — بہار ہو کہ خزاں، لا الٰہ الا اللہ (ضربِ کلیم)

اس لئے قرآن کی یہ صورت نہیں کہ کوئی خاص قوم اس پر عمل پیرا نہ ہو یا اسے ترک کر دے تو یہ اپنے نتائج پیدا کرنا چھوڑ دے اگر دنیا میں کوئی شخص بھی ایسا نہ رہے جو پانی کی دیگچی کو آگ پر رکھے تو اس سے پانی اپنی اس خاصیت کو کھو نہیں دے گا کہ وہ ایک خاص درجۂ حرارت پہ پہنچ کر بھاپ بن جاتا ہے۔ جب بھی کوئی شخص اسے آگ پر رکھے گا اس کی مضمر خاصیت مشہود ہو جائے گی۔ قرآن مجید ایک عالمگیر ضابطۂ ہدایت ہے۔ دنیا کی جو قوم جس زمانے میں بھی اسے اپنا ضابطۂ زندگی قرار دے گی اس کے خوشگوار نتائج سے بہرہ یاب ہو جائے گی۔ علامہ اقبالؒ نے قرآنی نظام کے قیام کے لئے ہندی مسلمانوں کے لئے آزاد مملکت کا مطالبہ اس لئے کیا تھا کہ انہیں اپنی ملّت سے بے پناہ محبت تھی اور وہ ہزار جان سے

---

(۱) یہ خطاب پمفلٹ کی شکل میں بھی شائع ہو چکا ہے۔

چاہتے تھے کہ اس شجرِ طیب کے حیات آور پھل سب سے پہلے اس کی جھولی میں گریں۔ مسلمانوں سے ان کی عمر بھر یہی تاکید رہی کہ ہر چند یہ اُمت، نکبت و زبوں حالی کا شکار ہے۔ اس میں بظاہر زندگی کا کوئی نشان دکھائی نہیں دیتا۔ اس میں کوئی کشش اور جاذبیت باقی نہیں رہی۔ اس کے باوجود، اس کے ساتھ پیوست رہنا ضروری ہے۔ بانگِ درا کی وہ نظم بڑی مشہور ہے جس میں انہوں نے کہا ہے کہ: ؎

ڈالی گئی جو فصلِ خزاں میں شجر سے ٹوٹ — ممکن نہیں ہری ہو سحابِ بہار سے

ہے لازوال عہدِ خزاں اس کے واسطے — کچھ واسطہ نہیں ہے اسے برگ و بار سے

ہے تیرے گلستاں میں بھی فصلِ خزاں کا دَور — خالی ہے جیبِ گُل زرِ کامل عیار سے!

جو نغمہ زن تھے خلوتِ اوراق میں طیور — رخصت ہوئے ترے شجرِ سایہ دار سے

شاخِ بریدہ سے سبق اندوز ہو کہ تو — ناآشنا ہے قاعدۂ روزگار سے

ملّت کے ساتھ رابطہ استوار رکھ
پیوستہ رہ شجر سے امیدِ بہار رکھ

(بانگِ درا۔ صلا۲۸)

دوسری جگہ بڑی دلسوزی کے ساتھ کہتے ہیں کہ: ؎

کہن شاخے کہ زیرِ سایۂ او پر برآوردی! — چوں برگش ریخت از دے آشیاں برداشتن ننگ است

اس زوال پذیر اُمت کے ساتھ ان کی یہ محبت تھی جس کی بنا پر وہ چاہتے تھے کہ قرآنی نظام کی نشاۃِ ثانیہ کی آماجگاہ اسی قوم کا صحن ہو۔ لیکن اس کے ساتھ، اللہ تعالیٰ کی یہ تنذیر بھی ان کے سامنے تھی جس میں کہا گیا ہے کہ: وَإِنْ تَتَوَلَّوْا يَسْتَبْدِلْ قَوْمًا غَيْرَكُمْ ثُمَّ لَا يَكُونُوا أَمْثَالَكُمْ۔ (۴۷/۳۸) "اگر تم نے اس (قرآن) سے اعراض برتا تو خدا تمہاری جگہ کوئی دوسری قوم لے آئے گا جو تمہارے جیسی نہیں ہوگی۔" وہ، اپنی قوم کے لئے دل کے نازک ترین گوشوں میں انتہائی جذباتِ محبت، اور دوسری طرف خدا کے اس اٹل قانونِ استبدالِ قومی کو جس انداز سے یک جا پیش کرتے ہیں اس کی مثال کم ملے گی۔ میں اسے بادیدۂ پرنم پیش کرتا ہوں۔ آپ اسے گوشِ نصیحت نیوش کے ساتھ سنئے۔ فرماتے ہیں: ؎

محفلِ ما، بے مے و بے ساقی است — سازِ قرآں را نواہا باقی است

زخمۂ ما بے اثر افتد اگر — آسماں دارد ہزاراں زخمہ ور

ذکرِ حق از امتاں آمد غنی — از زمان و از مکاں آمد غنی

ذکرِ حق از ذکرِ ہر ذاکر جدا است — احتیاجِ روم و شام او را کجا است

حق اگر از پیشِ ما برداردش — پیشِ قومے دیگرے بگذاردش

از مسلماں دیدہ ام تقلید و ظن — ہر زماں جانم بلرزد در بدن

ترسم از روزے کہ محرومش کنند
آتشِ خود بر دلِ دیگر زنند

(جاوید نامہ۔ ص۹۲-۹۱)

———— ۱/۰ ————

پیامِ اقبالؒ

عزیزانِ من! میں اس موضوع پر بہت کچھ اور بھی کہہ سکتا تھا لیکن قلتِ وقت کی بنا پر اتنے ہی پر اکتفا کرتا ہوں۔ اس سے آپ نے دیکھ لیا ہو گا کہ کلام و پیامِ اقبالؒ کا مرکز بھی قرآن ہے اور محور بھی قرآن۔ اس کی تعلیم کا عام کرنا ان کی زندگی کا مشن اور ان کا نصب العینِ حیات تھا۔ اور اس کو ایک عملی نظام کی شکل میں متشکل کرنے کے لئے انہوں نے پاکستان کا تصوّر دیا تھا۔ بلاشائبۂ تردید کہا جا سکتا ہے کہ ہماری ہزار سالہ تاریخ میں قرآنی پیغام اور حقائق کو حسن کارانہ انداز سے اس جامعیت کے ساتھ پیش کرنے کی مثال کہیں نہیں ملتی۔ اسی لئے انہوں نے کہا تھا کہ:ؔ

از تب و تابم نصیبِ خود بگیر   بعد ازیں ناید چو من مردِ فقیر

اس لئے کہ:ؔ

گوہرِ دریائے قرآں سفتہ ام   شرحِ رمزِ صبغۃ اللہ گفتہ ام
با مسلماناں غمے بخشیدہ ام   کہنہ شاخے را نمے بخشیدہ ام
عشقِ من از زندگی دارد سراغ   عقل از صہبائے من روشن ایاغ
نکتہ ہائے خاطر افروزے کہ گفت؟   با مسلماں حرفِ پرسوزے کہ گفت؟
ہمچو نے نالیدم اندر کوہ و دشت   تا مقامِ خویش بر من فاش گشت
حرفِ شوق آموختم وا سوختم   آتشِ افسردہ باز افروختم
با من آہِ صبحگاہے دادہ اند   سطوتِ کوہے، بکاہے دادہ اند
دارم اندر سینہ نورِ لا الٰہ   در شرابِ من سرورِ لا الٰہ
فکرِ من گردوں مسیر از فیضِ اوست   جوئے ساحل ناپذیر از فیضِ اوست

پس بگیر از بادۂ من یک دو جام
تا درخشی مثلِ تیغِ بے نیام
(مسافر۔ صفحہ ۴۴-۴۳)

انہیں خود اس کا احساس تھا کہ انہوں نے کس قدر پیامِ حیات بخش قوم کو دیا ہے اسی لئے انہوں نے کہا تھا کہ ——— اے خنک مردے کہ در عصرِ من است ——— (مسافر صفحہ ۴۳) ——— اس کے بعد سوچئے کہ ہماری شوریدہ بختی کس انتہا تک پہنچ چکی ہے کہ ہم نے اس نوائے حیات آور کی بھی کوئی قدر نہ کی اور اسے قوالوں کے حوالے کر دیا کہ وہ اسے ڈھولک کی تھاپ پر گائیں اور اس خوابیدہ قوم پر سکوتِ مرگ طاری کر دیں۔

"ڈھولک والوں" سے آگے بڑھ کر ہم، (نام نہاد) دانشوروں کے کوچے میں آتے ہیں تو وہاں ہمیں اس سے بھی زیادہ تاسف انگیز صورتِ حال کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ ان حضرات کی بارگاہ سے، علامہ اقبالؒ کو جو سب سے بڑا خطاب عطا ہوا، وہ "شاعرِ مشرق" کا تھا۔ اس خطاب کا اس شدومد سے چرچا کیا گیا کہ وہ اب ساری دنیا میں اسی حیثیت سے متعارف ہیں۔ آپ ذرا سوچئے کہ اگر کوئی مفکر اپنی حاصلِ فکر کا اظہار نثر میں کرے تو ہم اسے نثر نگاروں کی صف میں نہیں کھڑا کرتے۔ اسے مفکر ہی کہتے ہیں۔ لیکن اگر وہی مفکر، اپنی فکر کو زبانِ شعر میں پیش کرتا ہے تو ہم اسے مفکر نہیں کہتے شاعر کہتے ہیں۔ علامہ اقبالؒ اسی ستم ظریفی کا شکار ہیں۔ وہ عمر بھر کانوں پر ہاتھ رکھ رکھ کر پکارتے (بلکہ چلاتے)

میں شاعر نہیں! رہے کہ بابا! میں شاعر نہیں۔ مجھے شاعری سے کوئی سروکار نہیں۔ لیکن ان کے ستائش گر انہیں جھٹلاتے چلے جاتے ہیں اور بڑے فخر سے کہتے ہیں کہ تمہیں کچھ علم نہیں۔ تم شاعر ہو۔ اور بہت بڑے شاعر۔ علامہؒ نے اپنے پہلے مجموعہ نظم (پیامِ مشرق) کے ابتدائیہ میں کہا تھا کہ:

آشنائے من زمن بیگانہ رفت　　از خمستانم تہی پیمانہ رفت
من شکوہِ خسروی اورا دہم　　تختِ کسریٰ زیرِ پائے او نہم
او حدیثِ دلبری خواہد زمن　　رنگ و آبِ شاعری خواہد زمن
کم نظر بے تابیٔ جانم ندید
آشکارم دید و پنہانم ندید　　(پیامِ مشرق۔ ص۳)

اقبالؒ کے نام لیوا، بالعموم اس کے "آشکار" کے گرویدہ رہے۔ اس کے "پنہاں" تک کسی کی نگاہ نہ گئی۔ جن کی نگاہ اس کے "پنہاں" تک پہنچی تھی انہوں نے برملا کہا تھا کہ:

پردۂ تو از نوائے شاعری است　　آنچہ گوئی ماورائے شاعری است

(غنی کاشمیری۔ در۔ جاوید نامہ ص۱۹۵)

حضرت علامہؒ نے خود، سید سلیمان ندوی (مرحوم) کو ایک خط میں لکھا تھا:

میں نے کبھی اپنے آپ کو شاعر نہیں سمجھا۔ اس واسطے کوئی میرا رقیب نہیں اور نہ میں کسی کو اپنا رقیب تصور کرتا ہوں۔ فنِ شاعری سے مجھے کبھی دلچسپی نہیں رہی ــــ ہاں ــــ بعض مقاصدِ خاص رکھتا ہوں جن کے بیان کے لئے اس ملک کے حالات و روایات کی رو سے میں نے نظم کا طریقہ اختیار کر لیا ہے۔ (مکتوبات، حصہ اوّل۔ ص۱۹۵)

دیکھئے! وہ انہیں شاعر سمجھنے اور کہنے والوں کو کن الفاظ سے یاد کرتے ہیں۔ زبورِ عجم میں ہے:

نہ پنداری کہ من بے بادہ مستم　　مثالِ شاعراں افسانہ بستم
نہ بینی خیر ازاں مردِ فرودست　　کہ برمن تہمتِ شعر و سخن بست　　(ص۲۰۴)

اور جب یہ حضرات اس پر بھی باز نہیں آتے، تو وہ اس بارگاہ میں فریاد لے کر پہنچتے ہیں جس سے بلند بارگاہ ان کے نزدیک کوئی نہیں۔ دیکھئے وہ کس درد و سوز سے فریاد کرتے ہیں کہ:

بآں رازے کہ گفتم، پے نبردند　　زشاخِ نخلِ من خرما نخوردند
من اے میرِ اممؐ! داد از تو خواہم　　مرا یاراں غزل خوانے شمردند　　(ارمغانِ حجاز۔ ص۵۷)

اور اس کے بعد کہتے ہیں:

نہ شعر است ایں کہ بروے دل نہادم　　گرہ از رشتۂ معنی کشادم
بامیدے کہ اکسیرے زند عشق　　مسِ ایں مفلساں را تاب دادم　　(ص۵۸)

اور پھر یہ فریاد کہ:

تو گفتی از حیاتِ جاوداں گوے　　بگوشِ مردۂ پیغامِ جاں گوے

ولے گویند ایں حق نا شناساں که تاریخِ وفاتِ ایں وآں گوے (ص ۵۸)

وہ گفتۂ اقبال رحؒ کے متعلق کہتے ہیں کہ :-

آنچہ گفتم از جہانے دیگر است ایں کتاب از آسمانے دیگر است۔ (جاوید نامہ ص ۶)

اس میں شبہ نہیں کہ اقبال رحؒ نے جو کچھ کہا وہ "از جہانِ دیگر" تھا۔ شاعری نہیں تھا۔ لیکن یہ تسلیم کئے بغیر چارہ نہیں کہ (جیسا کہ میں نے پہلے بھی کہا ہے) انہوں نے شاعری کو جو بطور ذریعۂ ابلاغ اختیار کیا (خواہ اس کا مقصد کچھ ہی کیوں نہ تھا) اس سے ان کا پیغام وہ نتائج مرتب نہ کر سکا جو ان کا مدعا تھا۔ اس کے برعکس قوم نے اس کا غلط استعمال بھی کیا اور الٹا اثر بھی لیا۔ یہ اس لئے کہ آپ لاکھ کوشش کیجئے، شاعری "ڈھولک" سے الگ رہ نہیں سکتی اور ان دونوں کا آمیزہ اور عصارہ، افیون بن جاتا ہے۔ یہ وہ آمیزہ ہے جس کے متعلق خود علامہ نے (ابلیس کی زبان سے) کہلوایا ہے کہ :-

طبعِ مشرق کے لئے موزوں یہی افیون تھی ورنہ قوالی سے کچھ کم تر نہیں علمِ کلام (ارمغانِ حجاز ص ۲۱۶)

اس کے باوجود، پیغامِ اقبال رحؒ کو اگر اس کی فکر کے سرچشمۂ قرآنِ مجید کی روشنی میں سمجھا جاتا، تو اس سے ہماری قوم حیاتِ تازہ سے ہمکنار ہو سکتی تھی۔ لیکن قوم نے ایسا نہ کیا اور اس پر سکوتِ مرگ طاری رہا۔ اسے بھی سمجھ لیجئے کہ اگر قوم نے ایسا نہیں کیا تو یہ کوئی اتفاقی بات نہیں تھی۔ یہ ایک گہری سازش کا نتیجہ تھا جس کا تانا بانا کہیں اور بُنا گیا تھا۔ (جیسا کہ حضرت علامہ رحؒ نے اپنی مشہور نظم "ابلیس کی مجلسِ شوریٰ" میں کہا ہے) جہانِ ابلیس۔ یعنی مغرب کی استعماری قوتیں خوب سمجھتی تھیں کہ اگر دنیا کے کسی خطہ میں بھی قرآنی نظام قائم ہو گیا تو وہ ان کے لئے پیغامِ موت ہو گا۔ اس لئے ان کی انتہائی کوشش ہوتی ہے کہ —— ہو نہ جائے آشکارا شرعِ پیغمبر کہیں —— پاکستان ان قوتوں کو اس نظام کی اوّلیں آماجگاہ بنتا نظر آتا تھا کیونکہ یہی علامہ اقبال رحؒ کے پیغام کا اوّلیں مخاطب تھا۔ اور تجربہ گاہ تھا۔ چنانچہ ان قوتوں نے اپنی انتہائی لطیف فریب کاری سے کام لیتے ہوئے ایسا انتظام کیا کہ یہاں قرآن کا نام تو بیشک لیا جائے لیکن اس کا پیغام، عام نہ ہونے پائے۔ اور چونکہ اقبال رحؒ بھی قرآن کا پیغام بر تھا اس لئے یہ اہتمام بھی کیا گیا کہ اقبال رحؒ کو بھی اس کا صحیح مقام نہ مل سکے۔ ان کی یہ سازش بڑی کامیاب رہی ہے۔ اقبال رحؒ یہاں محض ایک شاعر بن کر رہ گیا ہے۔ قرآنی آواز طلوعِ اسلام کے مرکز سے اٹھتی تھی۔ اس کے خلاف اس قسم کا منظم پراپیگنڈہ کیا گیا ہے کہ وہ الحاد اور بے دینی کے مرادف قرار پا گئی ہے۔ لیکن اس کے باوجود میں مایوس نہیں اور قرآن کے پیغام اور اس کی روشنی میں، فکرِ اقبال رحؒ کو عام کئے جا رہا ہوں۔ میں محض اپنے قیاس کی بنا پر یہ فیصلہ کیوں کروں کہ قوم اب زندہ ہو ہی نہیں سکتی۔ اور پھر مایوس ہو کر بیٹھ جاؤں۔ یہ بھی تو قرآن کی روشنی میں، اقبال رحؒ ہی نے کہا تھا کہ :-

مرگ را ساماں ز قطعِ آرزو است زندگانی محکم از لاتقنطوا است

نا امید از آرزوئے پیہم است نا امیدی زندگانی را سم است

زندگی را یاس خواب آور بود ایں دلیلِ سستیٔ عنصر بود

از دمش میرد قوائے زندگی خشک گردد چشمہ ہائے زندگی (اسرار و رموز ص ۱۰۸)

قرآن کی یہی نشیدِ جانفزا ہے جو اس طول طویل سفرِ زندگی میں مجھے تھکنے نہیں دیتی، اور قدم قدم پر یہ کہہ کر میرا حوصلہ جوان کر دیتی ہے کہ :-

مسلم استی! سینہ را از آرزو آباد دار ہر زماں پیشِ نظر، لا یخلف المیعاد دار

والسلام